قانون توہین رسالت پر اختلاف

جاوید احمد غامدی، عمار ناصر اور مولانا زاہد الراشدی کا مؤقف

البرہان کا طرزِ عمل

ڈاکٹر محمد امین

ترتیب ، تہذیب، وفہرست

محمد علی جنید

ریسر چ اسکا لر ،شعبہ سیاسیات ،جامعہ کراچی۔

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی مرکز برائے تحقیق و دانش مندانہ مباحث

ایک آزاد غیر حکومتی ادارہ

مڑکورہ مضمون ماہنامہ البرھان ۔اشاعت ۔اکتوبر ۔۔۲۰۱۱ سے اخذ کردہ جس کے لئے ہم اُن کے مشکور ہیں

جامعہ کراچی مرکز برائے تحقیق و دانش مندانہ مباحث

۲۹۔اپریل۔۲۰۱۶

www.kurf.page.tl

majunaid@live.com

قانون توہین رسالت پر اختلاف

جاوید احمد غامدی، عمار ناصر اور مولانا زاہد الراشدی کا مؤقف

البرہان کا طرزِ عمل

البرہان کے قارئین کو پچھلے ایک سال میں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ البرہان کے پیش نظر کیا ہے اور اس کے اہداف کیا ہیں؟ ہم چاہتے ہیں کہ مسلم فرد اور معاشرے کی اصلاح ہو، اس کا نظامِ تعلیم و تربیت بدلے، معاشرے میں اتحاد و یکجہتی ہو، دینی وسیاسی قیادت اور سول سوسائٹی کے صالح عناصر معاشرے کی اصلاح اور مسائل کے حل کے لیے متحرک ہوں تا کہ فرد اور معاشرہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے ـــــ اور یہ اتنے بڑے مقاصد ہیں کہ ان کے لیے کام کرتے ہوئے اور ان کا حق ادا کرنے کے لیے نہ ہمارے پاس کافی وقت ہے اور نہ وسائل چہ جائیکہ ہم اختلافی امور میں پڑیں اور ان لوگوں سے مشاجرت کرتے پھریں جنہیں ہمارے مؤقف سے اختلاف ہو یا جن سے ہمیں اختلاف ہو لیکن اس کے باوجود البرہان کے تازہ شمارہ میں جاوید احمد غامدی صاحب، عمار ناصر صاحب اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کے حوالے سے طویل تحریریں موجود ہیں۔ آخر کیوں؟

بنیادی مسئلہ کچھ اور ہے

ظاہر ہے افراد سے الجھنا بے وقوفی ہے اور نہ ہمیں کسی سے ذاتی پرخاش ہے کہ الجھیں۔ اصل چیز ایشوز ہوتے ہیں اور ہم نے قلم اٹھایا ہے تو ایک اہم ایشو پر اور وہ ایشو یہ ہے کہ عصر حاضر میں مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں مسلم اہل علم کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے دینی حوالے سے سوچنے والا کوئی فرد آج اس سوال پر سوچے بغیر اور اس سوال کا جواب دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ آج کے مسلم فرد اور معاشرے کا بہت بڑا ـــــ اور ایک لحاظ سے سب سے بڑا ـــــ مسئلہ ہے لہٰذا کوئی مسلم سکالر، عالم، مفتی، محقق اور کوئی اسلامی تحریک، جماعت، تنظیم اور ادارہ اس سوال کا جواب دیے بغیر اور اس بارے میں کوئی مؤقف قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا (اور جو لوگ بظاہر اس سوال سے صرف نظر کرتے ہیں وہ بھی اس کے بارے میں عملاً کوئی نہ کوئی رائے قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں)۔

اس بارے میں ہمارا مؤقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب اپنی فکری اساسات اور عملی مظاہر کے لحاظ سے الحاد پر مبنی ہے اور اس تہذیب کے علم بردار اسلام اور مسلم دشمن ہیں لہٰذا ہمیں مغربی فکر وتہذیب کو رد کر دینا چاہیے اور اس امر کے باوجود کہ وہ آج کی غالب فکر اور تہذیب ہے، نہ اس سے مرعوب ہونا چاہیے اور نہ اس کی پیروی کرنی چاہیے بلکہ اسلامی احکام کی تشریح اور اسلامی منہج کی تشکیل اسلامی

اصولوں اور اسلامی مفاد کے مطابق کرنی چاہیے۔ تاہم فروعات میں اس تہذیب کے ایسے پہلوؤں سے محتاط اخذ و استفادہ کیا جاسکتا ہے جو اسلامی تعلیمات و مقاصد کے خلاف نہ ہوں کہ وہ ایک انسانی تجربہ تو بہرحال ہیں ہی۔

ہمارے اس مؤقف کے برعکس جناب جاوید احمد غامدی صاحب (اور ان کے تلامذہ) کا رویہ یہ ہے کہ وہ اسلام اور مغربی فکر و تہذیب میں مغائرت نہیں سمجھتے چنانچہ اسلامی احکام کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے اصول و مظاہر کو وہ مطابق اسلام قرار دے کر جائز قرار دیتے ہیں☆ ہم اس رویے کو متجددانہ اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں اور کچھ عرصہ پہلے ہم نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا جو اب ہم البرہان میں دے رہے ہیں۔

قانون توہین رسالت

مسئلہ توہین رسالت پر جاوید غامدی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اور ان کے تلمیذ خاص جناب عمار ناصر صاحب نے مہارت سے اسے آگے بڑھایا ہے وہ بھی یہی پس منظر رکھتا ہے کہ اہل مغرب خود بھی توہین رسالت کرتے ہیں (ڈنمارک کے کارٹون، ہالینڈ کی فلم وغیرہ) اور مسلمانوں میں سے جو دریدہ دہن ہوں ان کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں پناہ اور حمایت مہیا کرتے ہیں (سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین وغیرہ)۔ اس پس منظر میں جب پاکستان کی ملت اسلامیہ نے قانون سازی کر لی اور شاتم رسول کے لیے سخت سزا (سزائے موت) مقرر کردی تو اب امریکہ اور یورپ اس قانون کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ یہ ظالمانہ اور کالا قانون ہے اسے ختم کردیا جائے یا کسی طرح اسے غیر مؤثر بنادیا جائے یا اس کی سزا کم کردی جائے تاکہ اس امر کی شناعت میں کمی آئے اور اسے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ان کے مقامی چیلے چانٹے بھی اپنے آقایانِ ولی نعمت کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہی باتوں کا یہاں مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں جاوید غامدی صاحب کے تلمیذ خاص عمار ناصر صاحب کا یہ مطالبہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس قانون پر نظر ثانی ہونی چاہیے اور اس کی سزا کم کی جانی چاہیے بلکہ مجرم کو معافی کا حق ملنا چاہیے۔

اس مؤقف کے حق میں جاوید غامدی صاحب نے جو علمی نکتہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ احناف میں سے بعض نے گستاخیٔ رسول کو رِدّۃ (ارتداد) قرار دیا ہے کہ ایسا کرنے والا مسلمان نہیں رہتا، اہل ایمان سے خارج ہوجاتا ہے اور چونکہ ارتداد کے بارے میں معروف ہے کہ اس کے مرتکب کو توبہ کا موقعہ دیا جاتا اور اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے لہٰذا آج کے شاتم رسول کو بھی توبہ کا موقع دیا جانا چاہیے

☆ اور یہ رویہ بھی کوئی نیا نہیں۔ امت مسلمہ ماضی بعید میں معتزلہ کو اور ماضی قریب میں سرسید، امیر علی، قادیانی، چکڑالوی اور پرویز صاحب وغیرہ کو بھگت چکی ہے۔

اور اس کی معافی بھی قبول ہونی چاہیے۔ اپنے استاد امام کی بات کو جناب عمار ناصر صاحب نے اپنی علمی تحریر میں یوں پیش کیا ہے کہ احناف کا اکثریتی اور حقیقی مؤقف تو توہین رسالت کو ارتداد سمجھنے اور توبہ کے قبول کرنے کا ہے لہٰذا جو لوگ پاکستان کے قانون توہین رسالت (جس میں شاتم کی سزا سزائے موت ہے) کی حمایت کرتے ہیں وہ گویا احناف کے اکثریتی مؤقف کو نظر انداز کر رہے ہیں۔☆ اس پر بعض اہل علم نے ان کو جواب دیا کہ احناف کا اکثریتی مؤقف یہ نہیں ہے البتہ بعض احناف کا یہ مؤقف ضرور رہا ہے اور یہ کہ احناف میں بھی مفتیٰ بہ قول جمہور کی موافقت ہی کا ہے۔

اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے انتہائی خوبصورت بات مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ماہنامہ الشریعہ کے اکتوبر کے اداریے میں کہی ہے کہ ''فقہائے کرام کے علمی و فقہی اختلافات میں حسن و کمال کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں اور حالات کی ضروریات کے مطابق آپ کے پاس گنجائش موجود رہتی ہے کہ آپ مصلحت عامہ اور ملی مفاد کی خاطر ان میں سے کوئی مؤقف بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے اپنے ہی بزرگوں اور اسلاف میں سے کسی کے اختیار کردہ مؤقف کو باطل ثابت کرنے کی بے محل بحثوں میں الجھے رہنے کی بجائے اپنی علمی صلاحیتیں اور توانائیاں یہ واضح کرنے پر صَرف کریں کہ آج جس انداز میں مغرب کی ثقافتی یلغار ہماری دینی اقدار اور ملی روایات کو پامال کرنے میں مصروف ہے، توہین رسالت کا مسئلہ نارمل صورت حال میں رہنے کی بجائے مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی عالمی مہم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ مسلمانوں کی بے لچک جذباتی وابستگی کو جس شرم ناک طریقے سے چیلنج کیا جا رہا ہے، اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ گستاخ رسول کی سزا کو سخت سے سخت کیا جائے اور اس معاملہ میں کوئی لچک روا نہ رکھی جائے، جبکہ بہت سے فقہا کے ہاں حکومت وقت کو سیاستاً حد سے بھی زیادہ سخت اور سنگین سزا مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سادہ اور واضح استدلال کے ہوتے ہوئے توہین رسالت پر سزائے موت کے حوالے سے غیر ضروری فقہی اور فنی مباحث میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟'' اس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جا سکتا ہے کہ جاوید غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب نے احناف کے مؤقف کے حوالے سے شاتم رسولؐ کی سزا پر نظر ثانی اور تخفیف کا جو مطالبہ کیا ہے وہ بلا جواز اور نا قابل قبول ہے۔

ماہنامہ الشریعہ کی پالیسی

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے رئیس التحریر جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب ہمارے دوست اور ملی مجلس شرعی میں ہمارے رفیق کار ہیں۔ الشریعہ کی پالیسی کے حوالے سے ان کے دوسرے بہت

☆ مطلب یہ کہ لوگ توہین رسالت کریں اور پھر معافی مانگ کر گھر آ جائیں اور یوں توہین رسالت کھیل تماشا بن جائے

سے دوستوں اور اہل علم کی طرح ہمیں بھی ان سے اختلاف اور گلہ تھا اور ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر (جون ۲۰۰۹ء میں) انہوں نے الشریعہ میں اس پر بحث چھیڑی اور اپنے طرز عمل کا دفاع کیا ہم نے بھی اس بحث میں شریک ہونے کے لیے کچھ لکھا لیکن ان کے والد گرامیؒ کی وفات کی وجہ سے وہ بحث آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ تحریر بھی ہم البرہان میں دے رہے ہیں۔

اس بارے میں مولانا کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً کھلی بحث کا رواج نہیں ہے اور لوگ عموماً اپنے مسلک، اجتہاد اور تدبیر پر مبنی رائے کو قرآن حکیم کی طرح حرف آخر سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں لہٰذا وہ اپنے جریدے میں کھلے بحث مباحثہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تا کہ مسئلہ زیر بحث کے مختلف پہلو سامنے آسکیں۔ ہمیں اصولاً ان کے مؤقف سے اختلاف نہیں ہے اور کچھ حدود و قیود کے ساتھ اس پالیسی پر عمل کیا جاسکتا ہے لیکن گڑبڑ یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے جریدے کی کرسئ ادارت پر ایک ایسے شخص کو بٹھایا ہوا ہے جو جاوید غامدی صاحب کا دستِ راست اور تلمیذ خاص ہے اور علماء کرام کی بہت بڑی اکثریت جاوید غامدی صاحب کو سنت کا استخفاف، انکار اجماع اور قرآن کی من مانی تشریح کرنے والے کی حیثیت سے پہچانتی اور گمراہ سمجھتی ہے۔ مدیر کی حیثیت سے ان کے بیٹے عمار ناصر صاحب کو اپنے مخدوش دینی مؤقف کو پھیلانے اور اسے شرح و بسط سے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ بعض اوقات مخالفین کے ساتھ توازن بھی برقرار نہیں رکھ سکتے لہٰذا علماء کرام اور دوستوں کا مولانا زاہد الراشدی صاحب سے مطالبہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے جریدے کی ادارت سے اپنے مذکورہ بیٹے کو ہٹادیں، خود اس کی ادارت سنبھالیں یا کسی صحیح اور معتدل دینی مؤقف رکھنے والے شخص کو اس کا مدیر مقرر کریں۔ مولانا اپنے فیصلے کی مدافعت کرتے ہیں لہٰذا خود ان کے بارے میں چہ میگویوں کو راہ ملتی ہے اور لوگوں کو بدگمانی کا موقع ہاتھ آتا ہے اور بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جاوید غامدی صاحب نے عمار ناصر صاحب کو آگے رکھا ہی اس لیے ہے کہ وہ اس علمی خانوادے کو استعمال کر کے علماء دیوبند کے حلقے میں نفوذ کریں اور مولانا زاہد الراشدی صاحب اس کام میں بیٹے کی سرپرستی کررہے ہیں ورنہ اگر وہ غامدی صاحب کے درپردہ حامی نہ ہوتے تو اپنا رسالہ بیٹے کے حوالے نہ کرتے ۔ لہٰذا ان کے دیگر دوستوں کی طرح ہم بھی مولانا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مواقع تہمت سے بچائیں، اپنے خیر خواہوں کی بات پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور عمار ناصر صاحب کی بجائے کسی اور موزوں شخص کو الشریعہ کا مدیر مقرر کریں۔

تجدد - ایک غلط فکری منہج

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار پر ایک نظر

ہمیں عرصہ تک اس موضوع پر قلم اٹھانے میں تامل رہا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی (اور اپنے تئیں مثبت اور تعمیری) سرگرمیوں کو چھوڑ کر کسی ایسے شخص کی آراء کے بارے میں، جس سے آپ کو اختلاف ہو، قلم اٹھانا ہمیں مناسب نہ لگتا تھا لیکن اب احباب کے اصرار اور توجہ دلانے پر کہ محترم غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ[۱] کے بکثرت میڈیا میں آنے، دینی بحثوں میں حصہ لینے اور شعبۂ تعلیم میں مورچہ بندی[۲] کی وجہ سے ان کی فکر معاشرے میں پھیل رہی ہے لہٰذا اہل علم اور عوام کی توجہ ان کے موقف کی خامیوں کی طرف دلانا ضروری ہے تاکہ وہ اس حوالے سے متوازن رائے قائم کر سکیں، اس لیے یہ سطور قلم بند کی جا رہی ہیں۔[۳]

مضمون چونکہ طویل ہو گیا ہے اس لیے ہم نے اس کے مندرجات کی فہرست مرتب کر دی ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ مضمون کے مندرجات ایک نظر میں سامنے آ جاتے ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ مضمون کے اندر ہے کیا۔ دوسرے اگر کوئی قاری مضمون کا کوئی خاص جزو دیکھنا چاہے تو صفحہ نمبر کی موجودگی میں اسے تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔

۱۔ جاوید صاحب نے بڑی محنت سے اپنے شاگردوں کی ایک ٹیم تیار کی ہے جن میں سے نمایاں جناب خورشید احمد ندیم صاحب، عمار ناصر صاحب، ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب، رفیع مفتی صاحب، طالب محسن صاحب اور ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب وغیرہ ہیں۔

۲۔ المورد کے تجربے کے بعد میاں عامر محمود صاحب نے اپنی یونیورسٹی (یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب/UCP) کا شعبۂ اسلامیات ان کے سپرد کر دیا ہے جہاں وہ ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب کی سربراہی میں جاوید غامدی صاحب کی فکر کے مطابق اسلامی علوم کے ماہرین تیار کر رہے ہیں اور چونکہ انہوں نے فیس برائے نام رکھی ہے لہٰذا ملازمت کے لیے ڈگری کے خواہش مند طلبہ (خصوصاً دینی مدارس سے آنے والے طلبہ) وہاں دھڑا دھڑ داخلہ لے رہے ہیں اور توقع ہے کہ مستقبل میں ان میں سے بہت سے لوگ جاوید صاحب کی فکر کے علمبردار ہوں گے۔

۳۔ یہ تحریر اندازاً دو سال قبل کی ہے اور اب اشاعت کے لیے دیتے وقت اس پر معمولی نظر ثانی کی گئی ہے۔

مضمون کے مندرجات — ایک نظر میں

معاشرت

متفرق

دوسری دلیل: غامدی صاحب کا منہج فکر اور طریق استنباط جمہور امت سے الگ اور شاذ ہے

تجدد - ایک غلط فکری منہج

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار پر ایک نظر

ہماری دانست میں، اگر ہم مسئلے کا تعین کرنا چاہیں تو وہ ہے عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم و تشریح اور اجتہاد۔ مغربی فکر و تہذیب کے تناظر میں۔

اسلام

اصولاً تو اسلام ہی سارے انبیاء کا دین رہا ہے اور اسے ماننے والے مسلمان ہی تھے لیکن آج کل دوسرے ادیان و مذاہب سے الگ تشخص کے اظہار کے طور پر اسلام اس دین (اور شریعت) کو کہتے ہیں جس کی دعوت حضرت محمد ﷺ نے دی اور صرف ان کے پیروکار ہی مسلمان کہلاتے ہیں۔ اصولی اور نظری طور پر اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وسنت ہیں جو مسلمانوں کے ہاں پچھلے چودہ سو سال سے محفوظ چلے آرہے ہیں لیکن اسلام نے جب ایک معاشرے اور تہذیب کی صورت اختیار کی تو عملی زندگی میں ان مآخذ کے ساتھ ان کی تفہیم و تشریح اور اس تفہیم و تشریح کے مطابق عمل بھی اہمیت اختیار کر گیا اور اسلام کا ایک جزو اور مظہر بنتا چلا گیا۔

اسلام اور عصر حاضر

پیغمبر ﷺ نے اسلامی تعلیمات کے مطابق جو معاشرہ قائم کیا وہ الحمدللہ پچھلے چودہ سو سال سے بلاانقطاع قائم چلا آرہا ہے اور اس میں توسیع ہی ہوئی ہے تخفیف نہیں (سوائے اندلس جیسی ایک آدھ استثنائی مثال کے)۔ لہٰذا اس دوران امت کے بہترین دماغوں نے اسلام کی تفہیم و تشریح اور اس پر عمل کے حوالے سے جو عظیم علمی و تحقیقی کام کیا ہے وہ آج ہمارے پاس موجود بھی ہے اور محفوظ و مامون بھی۔ لہٰذا عصر حاضر کے حوالے سے اسلام کی Relevance پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ چودہ سو سال کا تاریخی سفر طے کر کے آج اسلام کس کیفیت و حالت میں ہے خصوصاً اس کی تفہیم و تشریح اور اس پر عمل کے حوالے سے ☆

اس پس منظر میں ہم اسلام اور عصر حاضر کی Relevance کے بارے میں سوچیں تو دو اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

اولاً: یہ کہ مسلمان جب تک اپنے دین سے وابستہ رہے اور اس کے مقتضیات پر عمل کرتے رہے ان

☆ اگرچہ بعض لوگ ایسے مواقع پر 'اسلام' کی بجائے 'مسلم' کا لفظ استعمال کرنا قابل ترجیح سمجھتے ہیں جیسے 'اسلامی تاریخ' کی بجائے 'مسلم تاریخ' کہنا — تاہم ہمارے نزدیک یہ محض لفظی اور تسمیہ کا اختلاف ہے لہٰذا غیر اہم ہے۔

میں وہ اوصاف بھی باقی رہے جو اس عالم اسباب میں دنیا میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ مسلمان ایک ہزار سال تک علم و تحقیق میں، تمدن و تہذیب میں، سائنس و ٹیکنالوجی میں، کاروبار اور تجارت میں، آلات ضرب و حرب میں ۔۔۔ دنیا کے امام رہے لیکن جب اپنے نظریۂ حیات سے ان کی وابستگی کمزور ہوگئی اور انہوں نے اس کے مقتضیات پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو منطقی طور پر ان میں وہ اوصاف بھی ناپید ہوتے چلے گئے جن کے بغیر اس عالم اسباب میں ترقی واستحکام ممکن نہیں چنانچہ وہ بتدریج زوال پذیر ہوتے چلے گئے۔

ثانیاً: اسلام اور مسلمانوں کے حریف عیسائی اہل مغرب نے، جو ماضی میں مسلمانوں سے علمی، نظریاتی اور دفاعی لحاظ سے شکست کھا چکے تھے — اور انتقام، نفرت اور ردِعمل کی نفسیات کے تحت اب قوت پکڑ چکے تھے — انہوں نے جب مسلمانوں کو روبہ زوال دیکھا تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر کے ان کی کمزور اور ہلتی ہوئی دیوار کو دھکا دے کر زمین بوس کر دیا۔

انہوں نے نہ صرف مسلم علاقوں پر قبضہ کیا، انہیں خوب کچلا، ان کے وسائل لوٹے اور ان کو غلام بنا لیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے سارے اجتماعی ادارے بھی تباہ و برباد کر دیئے اور ان کی جگہ اپنی فکر و نظر کے مطابق مسلم معاشرے میں نئے اجتماعی ادارے تشکیل دیئے تاکہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام رہیں اور کبھی سر اٹھا کر ان کے مدمقابل نہ آ سکیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ برصغیر میں پہلے مرحلے میں انہوں نے کوشش کی کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ دیں اور ان کا مذہب (عیسائیت) اختیار کر لیں لیکن شکست خوردگی کی حالت اور درماندگی کے باوجود مسلمان امت اس پر راضی نہ ہوئی اور نہ عیسائی علماء اور مناظر مسلمانوں کو مذہبی حوالے سے شکست دے سکے۔ چنانچہ استعمار نے اب پینترا بدلا اور نظام تعلیم و تربیت اور ذہن سازی و شخصیت سازی پر اثر انداز ہونے والے دیگر عوامل کے ذریعے یہ انتظام کیا کہ وہ مسلمانوں کے دل و دماغ کو فتح کرے اور انہیں اپنی فکر و تہذیب کا شائق بنا دے خواہ وہ نام کے مسلمان ہی رہیں (۱)۔

اس منصوبے میں انہیں خاصی کامیابی ہوئی اور جلد ہی وہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ کھڑے کرنے میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے اس منصوبے میں ان کا ساتھ دینے کی ابتداء کر دی۔ برصغیر کے تناظر میں اس موقع پر دو افراد کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ایک غلام احمد قادیانی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مسلمانوں میں سے جذبۂ جہاد ختم کر کے انہیں انگریز کی غلامی کا درس دیا اور دوسرے سرسید احمد خان جنہوں نے اہل مغرب کے نظام تعلیم کو مسلمانوں میں مقبول بنانے اور مسلمانوں کو مغرب پرستی سکھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

دوسری جانب چونکہ اہل مغرب کا نظریۂ حیات فاسد بنیادوں پر قائم تھا لہٰذا ان کی باہمی لڑائیوں (جنگ عظیم اول اور دوم) نے انہیں کمزور کر دیا اور بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اکثر مسلمان ممالک ان کے شکنجے سے نکل گئے۔ تاہم عیار استعمار نے اب بھیس بدل لیا اور ایک نئے روپ میں مسلمانوں کے سروں پر مسلط رہنے کی کامیاب منصوبہ بندی کر لی۔ اس منصوبہ بندی کے اہم اجزاء یہ تھے:

۔ اس نے مسلم ممالک سے نکلنے کے بعد اقتدار ان لوگوں کے سپرد کیا جو اس کے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل تھے، اس کے تربیت یافتہ اور اس کی فکر وتہذیب سے مرعوب اور اس کے شائق تھے اور اسے ہی بہترین طرز زندگی سمجھتے تھے۔ اس طرح اُس نے مسلم قیادت اور عوام کے درمیان بعُد اور کشمکش کی بنیاد رکھ دی اور سیاسی عدم استحکام کا پودا کاشت کر دیا۔ اس نے اپنے ان کاسہ لیس مسلم حکمرانوں کو اقتدار میں رکھنے اور اسلامی عناصر کو کچلنے اور ناکام بنانے میں ان کی بھرپور مدد کی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) اور ورلڈ بنک جیسے یہودی مالیاتی اداروں سے سودی قرضے دے کر انہیں موقع دیا کہ وہ انہیں اللوں تللوں میں اڑا دیں۔ یوں انہوں نے مسلم معاشروں کو معاشی طور پر کمزور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلم معاشروں میں ذہن سازی اور شخصیت سازی کرنے والے اداروں (نظام تعلیم اور میڈیا۔۔۔وغیرہ) کو ترغیب اور دباؤ سے اور اپنے گماشتہ حکمرانوں کی مدد سے اپنے رنگ میں ڈھال لیا تاکہ یکسو اور صاحب کردار مسلم شخصیت جنم ہی نہ لے سکے۔ یوں مغربی استعمار نے مسلمان ممالک کو بظاہر آزادی دینے کے باوجود انہیں ان کے نظریۂ حیات سے دور رکھنے اور انہیں اپنی فکر وتہذیب کا شائق اور متبع بنانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی۔

۔ تاہم اس کے باوجود بعض مسلم ممالک نظریاتی اور مادی حوالے سے کچھ ترقی کرنے اور سر اٹھانے کے قابل ہو گئے جس پر مغرب خصوصاً اس کے حالیہ سرخیل امریکہ نے پھر صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کر دی۔ چنانچہ پچھلی دہائی میں مغرب کی استعماری اور اسلام مسلم کش طاقتوں نے پہلے عراق کو تہس نہس کیا، پھر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور آج کل پاکستان کی باری ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان کے شر اور سازشوں سے بچائے (آمین)۔

۔ امریکہ اور یورپ صرف طاقتور مسلم ممالک ہی کو کچلنا نہیں چاہتے بلکہ ان کا اصل ہدف اسلام ہے۔ ان کے سکالرز اور تھنک ٹینک اسلام کو ہوّا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ کمیونزم کی شکست کے بعد انہیں نفسیاتی اور تزویراتی لحاظ سے ایک ''دشمن'' کی تلاش تھی جو انہوں نے 'اسلام' اور '

اسلامی تہذیب' کی صورت میں دریافت کرلیا ہے کیونکہ اسلام اپنی داخلی قوت کی بناء پر نہ صرف امریکہ و یورپ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اور اکثر جگہوں پر عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے بلکہ یہ دنیا کا واحد دین ہے جو مسلمانوں کی موجودہ ساری کمزوریوں کے باوجود مغربی فکروتہذیب کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کی یونیورسلائیزیشن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ مغربی حکومتوں خصوصاً امریکہ نے نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میڈیا وار شروع کر رکھی ہے، مسلمانوں کو بنیاد پرست، انتہا پسند اور دہشت گرد مشہور کرنا اور پرامن ذرائع سے تعلیمی ونصابی تبدیلی اور الیکٹرانک میڈیا میں نفوذ کے ذریعے مسلمانوں کے دل ودماغ جیتنا اور اگر پھر بھی وہ قابو نہ آئیں تو انہیں حیلے بہانے سے کچل ڈالنا، اس پر تو عمل ہو ہی رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے قلع قمع کے لیے مستقبل میں جو پالیسی بنتی نظر آرہی ہے وہ ہے اسلام کے ایک امریکی ایڈیشن کی تیاری۔ اس کے لیے ایک جعلی قرآن طبع کر کے دنیا بھر میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ احادیث کی ''تدوین نو'' کا ایک بڑا منصوبہ ترکی میں زیر عمل ہے اور ہر مسلم ملک میں سے ایسے علماء وسکالرز چنے اور چھانٹے جا رہے ہیں اور ان کی سرپرستی کی جا رہی ہے جو جدیدیت اور روشن خیالی کے نام پر مسلمانوں کو ان کی دینی روایات سے بیگانہ کر سکیں۔

عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وتشریح

یہ تھے اسلام اور مسلمانوں کے وہ حالات جن میں اسلام اور عصر حاضر کی Relevance ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہوگی خصوصاً جب ہم عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وتشریح کی بات کریں گے۔ لیکن اس موضوع پر براہ راست گفتگو سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسلام میں تفہیم وتشریح کی حدود پر کچھ گفتگو کرلیں اور اس ضمن میں زیر بحث آنے والی جدید، تجدید اور تجدد جیسی اصطلاحات کی کچھ وضاحت کردیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی قرار دیا تھا لہٰذا اس نے بعد میں آنے والے لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ انتظام فرمایا کیا کہ:

اولاً: کتاب (قرآن حکیم) کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی (۲)۔

ثانیاً: نبی کریم ﷺ کی دعوت کا دائرہ کار ساری انسانیت کو قرار دیا (۳)۔

ثالثاً: امت مسلمہ کو مشنری امت قرار دیا اور رہتی دنیا تک لوگوں تک دین پہنچانا اس کی ذمہ داری قرار دیا (۴)۔

رابعاً: قرآن کا اسلوب یہ رکھا کہ وہ امور جن کے بغیر معاشرہ صحیح بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا تھا، ان کا ذکر تفصیل سے کر دیا اور بتا دیا کہ یہ اصول نا قابل تغیر ہیں۔ اور جن امور میں لچک اور تغیر کی ضرورت تھی، جیسے اجتماعی زندگی کے مختلف سانچے اور ادارے (جیسے سیاسی نظام، معاشی نظام۔۔۔وغیرہ) تو وہاں صرف پالیسی اصول دینے پر اکتفا کیا اور تفصیلات کا تعین امت (کے اہل علم) پر چھوڑ دیا کہ وہ قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں اور مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اداروں کی تفصیلات عصری ضرورتوں کے مطابق خود طے کر لیں۔ یہ منہاج 'اجتہاد' کہلاتا ہے۔ اور چونکہ انسانی تمدن ترقی کرتا رہتا ہے، انسانی ضرورتیں لامحدود اور قرآن وسنت کی نصوص محدود ہیں اور اسلام ہمیشہ کے لیے، سارے زمانوں، سارے معاشروں اور سارے انسانوں کا دین ہے لہٰذا اجتہاد کا اصول اور اس پر عمل اسلام میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

☆ نو پیش آمدہ امور، نئی ضرورتوں اور جدید تقاضوں کا لحاظ رکھنے کے لیے اگرچہ اجتہاد کا اصول کافی ہے (نصوص قرآن وسنت کی تشریح جس کا ایک جزو ہے) تاہم اس سلسلے میں بعض مزید تفصیلات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

- نبی کریم ﷺ نے، جن کا فرمان عالی شان ہر مسلمان کے لیے حجت ہے، فرمایا کہ ہر نئی بات قبول نہیں کر لی جائے گی بلکہ صرف وہ بات قبول کی جائے گی جو اسلام کی نصوص اور ان کی روح اور شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہو اور ان کے خلاف نہ ہو۔ جو بات ان اصولوں پر پوری اترے وہ جائز مصلحت ہے اور اس کا لحاظ رکھا جائے گا اور جو اس پر پوری نہ اترے وہ بدعت ہے اور اسے رد کر دیا جائے گا(۵)۔

- دین چونکہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی نصوص نا قابل تغیر ہیں لہٰذا اجتہاد کے مذکورہ بالا منہج کے علاوہ اسے کسی تغیر کی ضرورت نہیں۔ تاہم تجدید کا لفظ اس مفہوم میں مسلم روایت میں ضرور بولا جاتا ہے کہ دین کو نکھار کر پیش کرنا، اسے غیر صالح رسوم ورواج اور بدعات سے پاک صاف کرنا تاکہ دین اسلام کا اصل چہرہ اور روپ نکھر کر اور واضح ہو کر سامنے آ جائے اور لوگوں کے لیے اس پر عمل آسان ہو جائے (۶)۔ اس تجدید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دین کی تعلیمات ایسے اسلوب میں پیش کی جائیں جو اس عہد کے لوگوں کی ذہنی ساخت اور فکری ضرورتوں کے مطابق ہوں تاکہ لوگوں کو دین کی تفہیم اور اس پر عمل میں آسانی رہے۔

- تاہم اسلام میں 'تجدد' کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ یہ قابل قبول ہے۔ تجدد، جیسا کہ باب تفعل کی خصوصیت ہے، یہ ہے کہ کسی ایسے امر کو جو اصلاً اسلام کی نصوص، اس کے مزاج، اس کی روح اور

اس کے مقاصد سے میل نہ کھاتا ہو اسے بوجوہ کھینچ تان کر اسلام کی تشریح و تاویل تبکلف اس طرح کی جائے کہ وہ اسلام کی نصوص، اس کے مزاج، اس کی روح اور اس کے مقاصد کے مطابق نظر آنے لگے۔ تجدد پر مبنی نصوص کی اس طرح کی تفہیم و تشریح اور اجتہاد کا سبب اگر غیر اسلامی اور اسلام مخالف نظریات سے مرعوب و متاثر ہو کر ان کی تائید و اثبات ہو اور ان کی طرف دعوت و اشاعت کا مقصد انہیں مسلمانوں کے لیے قابل قبول ٹھہرانا ہو تو بلاشبہ یہ ضلالت و گمراہی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس عمل کا محرک اگر ذاتی حب جاہ و منصب و مال ہو تو یہ اسلام اور مسلمانوں سے غداری ہے۔

- تجدید و تجدد کے حوالے سے یہاں ایک دو اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد اور چیز ہے اور اسلام کی تفہیم و تشریح نو اور چیز۔ ان کا کہنا ہے کہ اجتہاد نئے پیش آمدہ امور پر اسلامی حوالے سے غور و فکر اور ان میں حکم شرعی کی دریافت اور اس کا وضع و اطلاق ہے اور یوں یہ ایک فقہی مسئلہ ہے جب کہ دین کی تجدید اور تفہیم و تشریح عمومی حیثیت رکھتی ہے اور ضروری نہیں ہے کہ اجتہاد اس کا ایک لازمی جزو ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ یہ فرق موجود ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فرق محض اصطلاحی ہے ورنہ غایت اور منہج کے لحاظ سے دونوں میں اشتراک ہے۔

دیکھیے! اجتہاد کا بنیادی آلہ اور ذریعہ بھی نصوص اور ان کی وسیع تر تفہیم اور ایک سے زیادہ ممکنہ تشریح و تاویل ہی ہے، اگرچہ اس میں نصوص سے قیاس و استنباط اور ان کے مقاصد اور روح کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی تجدید کا انحصار بھی نصوص کی صحیح تفہیم و تشریح کے اثبات اور غلط تفہیم و تشریح کے رد پر ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کو نئے ماحول، نئے اسلوب، نئے انداز اور نئے دلائل کے ساتھ پیش کرنا بھی مجتہدانہ فکر و تعامل کا مقتضی ہوتا ہے لہٰذا ہر مجدد اصلاً مجتہد بھی ہوتا ہے گو اسے اصطلاحاً مجتہد نہ بھی کہا اور سمجھا جائے۔

☆ تجدید اس لیے قابل قبول اور قابل مدح ہے کہ وہ اسلام کے اصل رخ اور روپ کی بحالی ہے اور تجدد اس لیے قابل مذمت اور قابل رد ہے کہ وہ غیر اسلام کو اسلام بنانے کی سعی نامشکور ہے۔ اگرچہ اصحاب تجدید و تجدد دونوں اپنے استدلال کی عمارت نصوص ہی کی تفہیم و تشریح پر اٹھاتے ہیں تاہم دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مجدد دین کو حشو و زوائد اور بدعات سے پاک کر کے اسے اسلام کی اس تفہیم و تشریح کی طرف لوٹاتا ہے جسے ہم سہولت بیان کی خاطر اسلام کا مرکزی دھارا (Mainstream Islam) یا علم کلام کی اصطلاح کے قریب رہتے ہوئے 'جمہور کا اسلام' کہہ سکتے ہیں (جیسے اہل تشیع کے مقابلے میں اہل السنہ والجماعہ کی اصلاح) جب کہ متجدد نصوص دین کی تفہیم و تشریح اس طرح کرتا ہے کہ وہ اسے مین سٹریم اسلام سے کاٹ دینے کی سعی کرتا ہے کیونکہ

جب تک وہ ماضی کی متفق علیہ علمی روایات و مسلمات کو (جسے دینی روایت میں 'اجماع' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) رد نہ کرے اس کے تجدد کا پائے چوبیں کھڑا نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ہر متجدد کا اسلوب یہ ہوتا ہے کہ وہ حیلے بہانے سنت کو مشکوک ٹھہراتا اور اس کے دائرہ کار کو محدود کرنے کی کوشش کرتا ہے اور صدیوں کے تعامل سے قائم شدہ علمی مسلمات کی عمارت کو گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ان دونوں مقاصد کو پورا کرنے کے لیے قرآن سے براہ راست استنباط اور لغت و عقل سے استدلال کرتے ہوئے حریت فکر کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے۔ ایسے ہر متجدد کو مین اسٹریم اسلام یا جمہور اہل علم کا جواب یہی ہوتا ہے کہ اگر قرآن آج نازل ہوا ہوتا اور بغیر کسی پیغمبر کے نازل ہوا ہوتا تو ہم آپ کے دعاوی پر ضرور غور کرتے کہ فلاں معاملے میں قرآن کا یہ اور یہ منشا بھی ہوسکتا ہے لیکن جب قرآن ایک پیغمبر پر نازل ہوا تھا جس کی منصبی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس کی تبیین وتشریح کرے اور اس پر عمل کر کے دکھائے تو عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ قرآن کی ہر اس تفہیم وتشریح کو رد کر دیا جائے جو اس پیغمبر کی سنت کے خلاف ہو۔ اور یہ دین چونکہ چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا اور امت کے بہترین، متقی اور ذہین ترین افراد تب سے اس کو سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں تو آج ہم آپ کی اس لن ترانی کو کیسے مان لیں کہ اس دین کو آج تک آپ کے سوا ٹھیک طرح سے کوئی سمجھا ہی نہیں! لہٰذا عقل و منطق کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ تعامل پر مبنی متفقہ علمی مسلمات کو رد کرنے کی بجائے ان متجددین کے افکار موہومہ و مستوردہ کو رد کر دیا جائے۔

غامدی صاحب کے افکار مبنی بر تجدد ہیں

اسلام، عصر حاضر اور تجدید و تجدد کے مباحث پر ابتدائی گفتگو کے بعد آیئے اب اس مقالے کے عنوان کے دوسرے جزو کی طرف کہ آج کل جناب جاوید احمد غامدی صاحب جن افکار و خیالات کا اظہار فرمارہے ہیں اور دین کی جو تشریح و تاویل کر رہے ہیں کیا وہ جائز اجتہاد اور تجدید ہے یا تجدد؟ ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ جناب غامدی صاحب کے افکار تجدد پر مبنی ہیں اور ہماری یہ رائے یا دعویٰ دو دلائل پر مبنی ہے: ایک یہ کہ غامدی صاحب دین کی تفہیم وتشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے مغربی تہذیب کی ان اقدار و مظاہر و مقاصد کی تائید ہوتی ہے جو ملحدانہ، کافرانہ اور خلاف اسلام نظریات پر مبنی ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کا منہج فکر اور طریق استنباط جمہور امت سے الگ اور شاذ و منفرد ہے۔ اور اب ان دونوں باتوں کی کچھ تفصیل:

پہلی دلیل:

غامدی صاحب دین کی تفہیم وتشریح اس طرح کرتے ہیں جس سے مغربی تہذیب کی ان اقدار،

مظاہر اور مقاصد کی تائید ہوتی ہے جو خلاف اسلام نظریات پر مبنی ہیں۔

یہ دلیل یا رائے دو مقدمات پر مبنی ہے :ایک یہ کہ مغربی فکر و تہذیب خلاف اسلام ہے اور دوسرے یہ کہ غامدی صاحب اسلام کی تشریح وتعبیر نو کر کے جن افکار ونظریات کا اظہار و پرچار کر رہے ہیں وہ اس غیر اسلامی مغربی فکر و تہذیب کے نظریات و اقدار کے مطابق ہیں۔ اگر ہم یہ دونوں مقدمات ثابت کر دیتے ہیں تو ہمارا یہ موقف ثابت ہو جائے گا کہ جناب غامدی صاحب کے نظریات اجتہاد وتجدید کی بجائے تجدد کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں اور نا قابل قبول اور قابل رد ہیں۔

مقدمہ اولیٰ: مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں خلاف اسلام ہیں

یہ محض ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ مغربی تہذیب جن فکری بنیادوں پر کھڑی ہے وہ ملحدانہ اور خلاف اسلام ہیں۔مغربی تہذیب کی اساس ان فکری تحریکوں پر ہے جو وہاں قرون وسطی یا قرون مظلمہ کے بعد ابھریں اور جنھوں نے مغربی نظریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جیسے تحریک احیائے علوم (Renaissance)، تحریک اصلاح مذہب (Reformation)، تحریک روشن خیالی (Enlightenment)، تحریک جدیدیت (Modernity) اور تحریک پس جدیدیت (Post-Modernity)۔ ان فکری تحریکوں کے نتیجے میں جو افکار ونظریات سامنے آئے، وہ اگرچہ بہت سے ہیں لیکن ہم اختصار کی خاطر ان میں سے چار بنیادی نظریات ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹیل ازم اور ایمپریسزم کا ذکر کریں گے۔لیکن اس سے بھی پیشتر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ مغربی تہذیب کی موجودہ تشکیل میں ان کے مذہب (عیسائیت) کا کردار برائے نام ہے۔

مغربی تہذیب میں عیسائیت کا برائے نام کردار

مسلمانوں کے افکار اور ان کی تہذیب کا منبع چونکہ ان کا دین ہے لہٰذا وہ آسانی سے اس غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ مغربی تہذیب کا منبع بھی عیسائیت ہے اور عیسائیت بہر حال ایک منزّل من اللہ دین ہے، عیسائی اہل کتاب ہیں اور شریعت نے مسلمانوں کو اہل کتاب سے معاشرت (شادی بیاہ، کھانا پینا) کی اجازت دے رکھی ہے۔۔۔وغیرہ۔ یہ ساری غلط فہمیاں اس وقت دور ہو جاتی ہیں جب آدمی مغربی فکر کی تاریخ اور عیسائیت کا مطالعہ کرے اور اس کے علم میں دو بنیادی باتیں آئیں:

ایک: یہ کہ موجودہ مغربی تہذیب کی تشکیل میں عیسائیت کا کوئی بنیادی کردار نہیں ہے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ پر کوئی نئی شریعت نازل نہ ہوئی تھی وہ شریعت موسوی ہی کے پابند تھے لیکن بنی اسرائیل (یہودیوں) نے انہیں قبول کرنے کی بجائے ان کی مخالفت ومزاحمت کی اور انہیں شریعت موسوی کے مطابق معاشرے اور ریاست کی تشکیل کا کوئی موقعہ نہ ملا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعلیمات اخلاقی پندونصائح کا ایک مجموعہ بن

کر رہ گئیں۔رومنوں نے عیسائیت ضرور قبول کر لی لیکن رومن معاشرے کی نظری بنیادیں یونانی فکر پر مبنی تھیں اور یہ فکر بھی وحی کی ہدایت سے محروم بلکہ اس کی نقیض تھی اور توحید، رسالت اور آخرت کے بالمقابل عقل اور مادہ پرستی ہی اس کا شعار و منہج تھی۔ چنانچہ ۱۴۵۳ھ میں فتح قسطنطنیہ اور مسلمانوں کے غلبے کے ردعمل میں عیسائی دنیا میں مسلمانوں سے نفرت اور انتقام کی جو تند و تیز لہر ابھری اور جس نے انہیں ترقی وعروج کی راہ دکھائی اور جس کے نتیجے میں وہاں نشأۃ ثانیہ کی تحریک اٹھی وہ اسی یونانی فکر کے تسلسل اور احیاء کی تحریک تھی جس کی عقل اور مادہ پرستی کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

دوسرے: قرآن گواہی دیتا ہے کہ عیسائیت کے نام سے جو دین یا مذہب مروج ہوا وہ ان منزّل من اللہ تعلیمات سے انحراف پر مبنی تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھیں اور اصل حالت میں باقی نہ رہ سکیں اور ان میں خلاف وحی نظریات شامل ہو گئے (۷)۔ اس مبنی برانحرافات عیسائی مذہب میں چونکہ ایسی باتیں شامل تھیں جو غیر فطری تھیں اور اُس وقت کی سائنسی فکر پر مبنی تھیں جو بعد میں عقلی اور سائنسی ترقی سے غلط ثابت ہوئیں اور مزید یہ کہ عیسائی مذہبی قیادت اس غیر سائنسی اور غیر فطری مذہب کو مقدس آسمانی مذہب قرار دے کر اس کی محافظ بن کر کھڑی ہو گئی، چرچ نے ایک مستحکم ادارے کی شکل اختیار کر لی اور حکمرانوں اور جاگیرداروں سے مل کر اس نے اپنے روحانی تقدس کو دنیاوی اقتدار کی شکل دے لی۔ چنانچہ مغرب میں جب روشن خیالی، عقلیت، انفس و آفاق میں تدبر اور سائنس کی لہر ابھری تو اس کا شدید تصادم عیسائیت کی علمبردار قیادت سے ہوا اور یورپ کی تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ عیسائی قیادت نے کس بے دردی سے اس لہر کو کچلا، ہزاروں دانشوروں کو مذہبی عدالتوں سے سزا دلوائی، انہیں زندہ جلا دیا گیا اور طرح طرح کی تعذیبوں سے گزارا گیا۔ اس کے ردعمل میں مارٹن لوتھر اور دوسرے مفکرین نے اصلاح مذہب (Reformation) کی تحریک چلائی اور مروجہ عیسائیت کا سحر اور ڈھانچہ توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم، ایمپریسزم وغیرہ جیسے نظریات ابھرے جنہوں نے عیسائیت کو رد کر کے اسے کونوں کھدروں میں دھکیل دیا اور مغربی تہذیب الحاد و مادہ پرستی کے منہج پر آگے بڑھتی چلی گئی۔

مطلب یہ کہ موجودہ مغربی تہذیب کی صورت گری میں عیسائیت کا کوئی بڑا کردار نہیں بلکہ یہ تہذیب تو ابھری ہی مذہب (عیسائیت) کے رد پر ہے اور ہیومنزم و سیکولرزم وغیرہ کی شاندار عمارت کی تعمیر عیسائیت کے جسد خاکی پر ہی تو ہوئی ہے لہٰذا عیسائیت کو اسلام کی طرح وہاں کی تہذیب کا صورت گر سمجھنا محض لاعلمی اور غلط فہمی ہے۔ مغربی تہذیب کی صورت گری جن افکار نے کی ہے اب ان کا ذکر اختصار سے کیا جاتا ہے (۸)۔

ہیومنزم (Humanism)

قرون مظلمہ کے بعد اور نشاۃ ثانیہ کے وقت ہیومنزم کی ابتداء اس سے ہوئی کہ کائنات میں مرکزی حیثیت اور اہمیت انسان کو حاصل ہے لیکن بعد میں اس نے جو رنگ اختیار کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے کہ زندگی کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کرے اور یہ طے کرے کہ اسے زندگی کن اصولوں کے مطابق گزارنا ہے۔ وہ 'اللہ' جیسی کسی بالاتر ہستی کا 'عبد' نہیں ہے جس کے احکام کی اطاعت اس پر لازم ہو بلکہ وہ خود مختار اور مختار مطلق ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی ،حق و باطل، خیر و شر، جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے بارے میں جو فیصلے چاہے کر سکتا ہے۔

سیکولرزم (Secularism)

انحرافات کے باوجود عیسائیت بہر حال ایک منزل من اللہ دین تھی جس میں خدا کا تصور موجود تھا، (خواہ ناقص ہی سہی) لہٰذا ہیومنزم کی مخالفت ہوئی اور اس کے ردعمل میں سیکولرزم کا نظریہ ابھرا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ بالفرض اگر کسی کو خدا کو ماننا ہی ہے تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اور انفرادی حیثیت سے اسے مان لے لیکن اس خدا کو انسانوں کے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق بہر حال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مطلب یہ کہ سول سوسائٹی اور ریاست کے معاشی، معاشرتی، قانونی، تعلیمی، سماجی ۔۔۔ ڈھانچے اور نظام میں اللہ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں بلکہ انسان آزاد ہے کہ ان معاملات میں اپنی مرضی اور اپنی عقل سے جو فیصلے چاہے کرے۔

کیپٹل ازم (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام اگرچہ ابتداءً ایک معاشی نظام تھا اور ہے لیکن اس کے وسیع اثرات نے اسے عملاً ایک متبادل دین اور طرز حیات بنا دیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی ساری کوششوں کا محور دنیا اور افزائش دولت ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حاصل ہے حب دنیا اور حبّ مال۔ مطلب یہ کہ انسان کی ساری تگ و دو اس غرض سے ہونی چاہیے کہ اسے دنیا میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور سہولتیں ملیں۔ اس کا مقصد زندگی یہ ہو کہ ہر قیمت پر بنک بیلنس بڑھے، کار ہو، بنگلہ ہو اور معیار زندگی بلند سے بلند تر ہو۔ حبّ دنیا اور حبّ مال بلکہ حرص و ہوس اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے، اسی کی بہتری اور کامیابی کے لیے اپنی ساری تگ و دو کو وقف کرنے اور اسی کو حاصل زندگی سمجھنے اور ہدف زندگی بنانے کا لازمی نتیجہ ہے آخرت سے اغماض اور اس کی عدم اہمیت اور عدم ترجیح۔

ایمپیریسزم (Empiricism)

ایمپیریسزم کا مطلب یہ ہے کہ علم حقیقی کا منبع صرف حواس اور عقل ہیں۔ یعنی حق صرف وہ ہے

ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آ سکے اور عقل واستدلال کے معیار پر پورا اترے۔ جو ان معیارات پر پورا نہ اترے وہ علم نہیں، اس کے حق اور حتمی طور پر صحیح ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں بلکہ ایسے نظریات عموماً غیر سائنٹفک اور توہمات پر مبنی ہوتے ہیں۔

مغرب میں اس کے علاوہ بھی بہت سے ازم ہیں جیسے لبرلزم، یوٹیلیٹیرنزم (Utilitarianism)، ری ڈکشنزم (Reductionism)۔۔۔ وغیرہ لیکن جن چار اہم تصورات کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے، اگر ہم صرف انہی کو سامنے رکھیں تو مغرب کا جو ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور اِلٰہ اور تصور کائنات) ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تصور انسان کی رو سے انسان خود اپنی مرضی کا مالک ہے، خود مختار ہے اور کسی کا عبد نہیں ہے۔ اس کا تصور الٰہ یہ ہے کہ کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اس پر لازم ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنا خدا خود ہے (ہیومنزم)۔ اور اگر کوئی خدا ہے بھی تو اسے انسان کے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ گویا یہ انسانوں کی مرضی اور اختیار ہے کہ وہ خدا کے دائرہ کار کا تعین کریں (سیکولرزم)۔ کیپٹل ازم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور ہماری ساری تگ و دو کا محور یہی زندگی ہونی چاہیے گویا عملاً آخرت کی نفی۔ اسی طرح ایمپریسزم کا حاصل ہے وحی کی سیادت کا انکار اور عقل وحواس ہی کو منبع علم وحقائق سمجھنا۔

اس مختصر تجزیے سے واضح ہے کہ مغرب کا ورلڈ ویو اسلام کے ورلڈ ویو کے برعکس ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ انسان عبد ہے اور ایک اللہ ہی معبود اور مطاع ہے جب کہ ہیومنزم اور سیکولرزم کی رو سے اللہ کی بجائے خود انسان مختار کل اور مختار مطلق ہے۔ کیپٹل ازم کی رو سے دنیا ہی سب کچھ ہے جب کہ اسلام کی رو سے آخرت ہی سب کچھ ہے اور اسے دنیا پر ترجیح حاصل ہے۔ ایمپریسزم کی رو سے صرف عقل وحواس ہی منبع علم ہیں جب کہ اسلام کی رو سے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی وحی (قرآن حکیم) ہی حقیقی اور حتمی علم ہے۔

ان امور سے واضح ہے کہ مغرب کے وہ افکار ونظریات جن پر اس کی تہذیب کی عمارت کھڑی ہے، صریحاً خلاف اسلام ہیں اور اسلامی عقائد سے متصادم ہیں۔ اسلام نام (لغت واصطلاح میں) ہے اللہ کی غیر مشروط اطاعت کا اور مغرب کے مذکورہ بالا افکار کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت کا انکار۔ یہی کفر ہے (لغت واصطلاح دونوں میں) یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار اور انسان کا اپنی مرضی پر اصرار۔ لہٰذا یہ کہنا محض ایک حقیقت کا اظہار ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مغربی تہذیب کی فکری اساسات کفر والحاد پر مبنی ہیں۔

غامدی مکتب فکر کے بعض افراد کی تائید

یہی وجہ ہے کہ جب سے علماء اسلام کا اس مغربی فکر وتہذیب سے پالا بڑا ہے، انہوں نے اس کی گمراہی اور دجل وفریب کا برملا اظہار و اعلان کیا ہے۔ جمال الدین افغانی اور امیر شکیب ارسلان سے لے کر ماضی قریب کے امام حسن البنا، سید قطب (جو اسے 'جاہلیت جدیدہ' کہا کرتے تھے) اور برصغیر کے اکبرالہ آبادی، علامہ محمد اقبال، مولانا مودودی اور روایتی علماء میں سے جمعیت علماء اسلام اور احرار کی تحریکیں تو انگریز اور انگریزی استعمار کے فکر ونظر سے شدید نفور کرتی تھیں۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ جو سرسید، امیر علی، قادیانی، پرویز وغیرہ کا ہے وہ مغربی فکر وتہذیب کی براہ راست یا بالواسطہ طور پر تائید کرتا ہے۔ غامدی صاحب بھی اسی دوسرے فکری گروپ کے گل سرسبد ہیں لہٰذا عموماً مغربی فکر وتہذیب کی تنکیر نہیں کرتے البتہ ان کے مکتب فکر کے بعض دوسرے لوگ غالبًا اس بات کی باریکی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مغربی فکر وتہذیب کے بعض پہلوؤں کی تنقید وتنقیص کر بیٹھتے ہیں۔ فی الحال اس کی دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

۱۔ عظیم فریب پر مبنی فکر وفلسفہ

غامدی صاحب کے پرچے اشراق میں سوال و جواب کے کالم میں ان کے ایک تلمیذ رشید نے دجال کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مغربی اقوام کو دجال اور یاجوج ماجوج قرار دیا اور ان کے فکر وفلسفہ کو عظیم فریب پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا: (۹)

''ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قیامت کے قریب 'یاجوج ماجوج' ہی کے خروج کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر و فلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے نبی ﷺ نے انہیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔ روایات میں دجال کی ایک صفت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ اس کی ایک آنکھ خراب ہوگی۔ یہ بھی درحقیقت مغربی اقوام کی انسان کے روحانی پہلو سے پہلوتہی اور صرف مادی پہلو کی جانب جھکاؤ کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح مغرب سے سورج کا طلوع ہونا بھی غالبًا مغربی اقوام کے سیاسی عروج ہی کے لیے کنایہ ہے۔''

۲۔ مغربی اثرات کی بیخ کنی

اسی طرح غامدی صاحب کے 'استاذ امام' مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ماہنامہ 'چراغ راہ' کراچی میں پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے حوالے سے لکھا کہ اس کے لیے مغربی تہذیب کے بُرے اثرات سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ ان کے الفاظ میں: (۱۰)

''ہمارے ملک میں انگریز اپنے طویل دور اقتدار کے جو اثرات ہمارے ذہنوں کے اندر اور ہماری تہذیب و معاشرت کے اوپر چھوڑ گئے ہیں وہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی بدستور قائم ہیں بلکہ ملکی حکمرانوں کے دور میں وہ مزید مستحکم ہوئے ہیں۔ یہ اثرات اگر اس طرح باقی رہیں تو ان میں اور اسلامی قانون میں قدم قدم پر تصادم ہوگا۔ اور اس تصادم میں اسلامی قانون ایک طرف ہوگا اور وہ قوم جس کو ہم اسلامی قانون کا مطالبہ کرنے والی سمجھتے ہیں دوسری طرف ہوگی۔ انگریزی اقتدار کے زیر اثر شراب، جوا، رقص و سرود، بے حیائی و بے پردگی، ریڈیو، سینما، اور زنا کاری کی جو چاٹ لگ چکی ہے اس کو موجودہ قانون سے نہیں روکا جا سکتا، بلکہ ان چیزوں کے مقابلہ میں اگر تنہا قانون آئے گا تو میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ اور یہ شکست نہایت بری شکست ہوگی۔ ان چیزوں کے مقابلہ میں قانون سے پہلے پروپیگنڈے کی طاقت کو آنا چاہیے اور یہ طاقت اتنی زبردست ہونی چاہیے کہ ان چیزوں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں اتنی شدید نفرت پیدا ہوجائے کہ لوگ ان کے خلاف قانون بنانے کے لیے قانون سازوں کو مجبور کردیں اور جب ان کے خلاف قانون بن کے آئے تو اس کا اسی طرح خیر مقدم کریں جس طرح مسلمانوں نے کسی زمانے میں ان برائیوں کے خلاف قوانین کا خیر مقدم کیا تھا''۔

مقدمہ ثانیہ: غامدی صاحب کے نظریات مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ہیں

یہ واضح کرنے کے بعد کہ مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں ان نظریات پر استوار ہیں جو اپنی کنہ میں غیر اسلامی اور خلاف اسلام ہیں، اب ہم یہ عرض کریں گے کہ غامدی صاحب جن افکار و نظریات کے داعی اور مبلغ ہیں وہ مغربی افکار نظریات کا چربہ ہیں اور ان کے مقاصد کی آبیاری کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر غامدی صاحب قرآن و سنت کی نصوص کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ مغربی نظریات و مقاصد کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے اب ہم غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کے افکار کا ایک جائزہ لیں گے:

جہاد کا انکار

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ اہل مغرب نے طاقت پکڑنے کے بعد روبہ زوال امت مسلمہ کے خلاف سازشیں کیں، ان کے سیاسی نظام (خلافت) کو تاراج کیا اور مسلمان ملکوں پر قبضہ کرلیا۔ ان کے وسائل کو لوٹا، ان کے اجتماعی نظام اور اداروں کو تباہ و برباد کیا اور نئے اجتماعی ادارے اپنی فکر و تہذیب کے مطابق تشکیل دیئے اور بھرپور سعی کی کہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام اور پیروکار رہیں اور مزاحمت نہ کریں بلکہ صحیح تر لفظوں میں مزاحمت کر سکنے کے قابل نہ رہیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں

میں سے روح جہاد ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور مسلمان علماء میں ہمیشہ ایسے افراد پیدا کرنے کی سعی کی اور ان کی خوب حمایت وسر پرستی کی جو مسلمانوں کے اندر سے روح جہاد ختم کریں اور انہیں حیلے بہانے مغرب کے اقتدار کو قبول کرنے کی ترغیب دیں۔ مسلم روایت اور خصوصاً برصغیر میں اس کی ایک پوری تاریخ ہے جس کے گل سر سبد غلام احمد قادیانی ہیں جن کی نبوت کا مرکزی نقطہ ہی یہ تھا کہ جہاد بالسیف اب منسوخ ہو چکا ہے۔ آج کل غامدی صاحب مغرب کی اس ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اور ان کے تلامذہ جہاد کے مختلف پہلوؤں کی جو تشریح وتاویل کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہے:

☆ مسلم حکومت کی شکست کی صورت میں مسلمان عوام اور ان کے گروہوں کو جہاد کی اجازت نہیں(۱۱) (افغانستان میں مسلم حکومت کے خاتمے اور جارح کی حلیف گماشتہ حکومت قائم ہونے کے بعد وہاں مسلمان عوام اور ان کی جماعتوں نے جہاد شروع کر دیا اور پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن غامدی صاحب کے نزدیک وہ غلط تھا)(۱۲)۔

☆ جارح کفار کو مسلم ملک سے نکالنے کے لیے فدائی حملے جائز نہیں(۱۳) (جنہیں اسلام دشمن اور ان کے ایجنٹ 'خودکش حملے' قرار دیتے ہیں)۔

☆ افغانستان پر امریکہ و یورپ کا حملہ کرنا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کی بستیاں تاراج کرنا، ان کے گھر جلانا، ان کی خواتین کی عزتیں لوٹنا اور ان کے ملک پر قبضہ کر کے بیٹھ جانا جائز تھا کیونکہ اس نے ایک ایسے شخص کو پناہ دی تھی جو امریکہ و یورپ کا ''مجرم'' تھا (حالانکہ وہ محض ''ملزم'' تھا اور کروڑوں مسلمانوں کے علاوہ لاکھوں یورپی اور سینکڑوں امریکی و یورپی محقق اور دانشور امریکہ کے اس دعوے کو غلط قرار دیتے ہیں لیکن غامدی صاحب مسلم امت کے موقف کی نفی کرنا اور یہودیوں اور ان کے زیر اثر مغربی حکمرانوں کی تائید کرنا عین اسلام سمجھتے ہیں)۔

☆ رسول کریم ﷺ نے کفار کے خلاف جو جہاد کیا تھا وہ حکم شرعی نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون اتمام حجت تھا۔(۱۴)

☆ منکرین حق کے خلاف جنگ کرنا اور انہیں مفتوح اور ذمی بنانے کا حکم اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔(۱۵)

فقہ وقانون

بعض اہم فقہی اور قانونی معاملات میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے:

۱۔ زنا بالرضا کی شناعت کم کرنا

اسلام میں قانون اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے یا اس کے

پیغمبر نے ہم پر واضح کیے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا اسلوب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے وہ پہلو جن پر انسان کی معاشرتی زندگی کے صحیح بنیادوں پر قیام کا انحصار ہے وہ ان کے بارے میں نا قابل تغیر احکام دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کی تفصیلات اور ممکنہ تغیرات کے لیے اجتہاد کی اجازت دیتا ہے۔ جن امور میں اس نے تفصیلی اور نا قابل تغیر احکام دیئے ہیں ان کی بناء شریعت کے مقاصد خمسہ پر ہے جن میں سے ایک حفاظت نسل ہے۔ اس کے لیے شریعت نے عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے تفصیلی احکام دیئے اور ناجائز جنسی تعلق (زنا) کے لیے انتہائی سخت سزائیں تجویز کیں یعنی رجم اور کوڑے مارنا۔ اس کے برعکس مغرب نے ہیومنزم کی رو سے فرد کو خود مختار بلکہ مختار مطلق بنا دیا جس کے نتیجے میں فرد کی لامحدود آزادی کا تصور ابھرا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت مغرب میں آزاد ہیں کہ جب چاہیں اور جس سے چاہیں آزادانہ جنسی تعلق قائم کر لیں۔ چونکہ قانون وہاں انسان نے بنانا ہے اور انسانوں کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق بنانا ہے لہٰذا مغربی ممالک کی پارلیمانوں میں عوام کے نمائندوں نے عوام کی امنگوں کے مطابق جو قانون سازی کی ہے اس کی رو سے مرد اور عورت بغیر نکاح کئے عائلی زندگی گزار سکتے ہیں اور بچے پیدا کر سکتے ہیں یعنی زنا بالرضا وہاں جائز اور قانونی ہے البتہ زنا بالجبر کو وہاں برا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے نسل اور عزت کی حفاظت مقصود ہے بلکہ اس لیے کہ ہیومنزم کی رو سے وہ فرد کی حریت، تقدیس اور حرمت کے خلاف ہے۔

اب مغربی تہذیب چونکہ غالب ہے اور مغرب اسے مسلمان معاشرے میں بھی مروج کرنا چاہتا ہے تو اس کی خواہش ہے کہ مسلمان ممالک اہل مغرب کے طرز معاشرت کو قبول کر لیں اور خصوصاً زنا کے بارے میں جو سخت قوانین اور رویہ مسلمانوں میں موجود ہے، اسے کمزور اور ختم کیا جائے۔ اس ضمن میں اسلام کے قوانین انتہائی جامد اور سخت ہیں اور مسلمان ان پر صدیوں سے عمل کرتے آرہے ہیں اور ان کے اندر اس بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں لہٰذا اس حوالے سے مسلم قانون اور روایت میں ڈنٹ ڈالنا آسان نہیں۔ اس لیے اس معاملے پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہونے کے لیے غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر نے جو راستے اختیار کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر زنا بالرضا کی شناعت کم کی جائے۔ اس شناعت کو کم کرنے کے لیے غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر نے اپنی تاویل کی زنجبیل سے دو نسخے نکالے ہیں:

ایک: یہ کہ رجم کی سخت سزا صرف زنا بالجبر کے لیے (بطور حرابہ اور فساد فی الارض) ہے جب کہ شادی شدہ (محصن) افراد کی زنا بالرضا کی سزا وہی ہے جو غیر شادی شدہ (غیر محصن) افراد کے زنا بالرضا کی

ہے یعنی سو کوڑے۔ (۱۶)

اہم نوٹ: ہمارے اس مقالے کا اسلوب یہ نہیں کہ ہم غامدی صاحب کا نقطۂ نظر ان کی کتابوں سے تفصیل کے ساتھ نکالیں اور اسے ثابت کریں یا اس کے مقابلے میں جو صحیح اسلامی نقطۂ نظر ہے، اس کے لیے دلائل لائیں اور اسے ثابت کریں۔ یہ کام کئی اہل علم نے پہلے بھی کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ہمارا اسلوب یہاں، اختصار کی خاطر، یہ ہے کہ ہم غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر کی مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اس سے مطابقت کی کاوشوں کو نمایاں کریں لہٰذا ہم غامدی صاحب کے موقف کو تفصیل سے بیان کرنے اور ثابت کرنے کی بجائے محض اس کے حوالہ جات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں اور صحیح اسلامی موقف اتنا معروف و معلوم ہے کہ اس کے لیے ہم نے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ اس کے لیے حوالہ جات درج کریں۔ اگر ہم یہ اسلوب اختیار نہ کرتے تو یہ مضمون ایک کتاب بن جاتا، جو فی الحال ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔

دوسرے: یہ کہ زنا بالرضاء کی تعزیزی سزا کو کم کیا جائے اور اس کا نفاذ مشکل بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ غامدی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان کے قانون میں امریکہ کے گماشتہ فوجی آمر (جنرل مشرف) کے دورِ حکومت میں پاکستان کے حدود قوانین کو تبدیل کرنے اور 'تحفظ حقوق نسواں' کے نام پر مسلمانوں کے روایتی قانون میں زنا بالرضاء کی سزا کم کرنے کے لیے 2007ء میں چلائی جانے والی مہم کی پرزور حمایت کی (اس کے لیے ذرائع ابلاغ میں ایک بڑی مہم چلائی گئی جس کی مغربی ذرائع ابلاغ اور حکومتوں نے علانیہ حمایت کی اور جس کے بارے میں یہ خبر عام تھی کہ وہ امریکی سرپرستی اور فنڈز سے چلائی گئی) جس کے اسلامی حوالے سے نفس ناطقہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ تھے۔

قانون توہین رسالت کو غیر مؤثر بنانا

مسلمان نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک سے غایت درجے کی جذباتی محبت رکھتے ہیں اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ امت مسلمہ کی موجودہ صورت میں بقاء اور استحکام کا دار و مدار جن امور پر ہے ان میں سرفہرست حب رسول ﷺ ہے۔ مغربی ممالک کے یہود و نصاریٰ کو، جو بقول قرآن، مسلمانوں کو نامسلمان بنانا چاہتے ہیں (۱۷)، مسلمانوں کی یہ ادا ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ حیلے بہانے نبی کریم ﷺ کی توہین کرتے رہتے ہیں کبھی کارٹون بنا کر، کبھی کتابیں لکھ کر، کبھی فلمیں بنا کر اور وہ مسلمانوں کے اندر سے حبِّ رسول ﷺ کا جذبہ نکالنا چاہتے اور اسے کم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں جب سے توہین رسالت کا قانون بنا ہے، مغربی ممالک اسے ختم کرانے یا کم از کم اسے غیر موثر اور ناقابل نفاذ بنانے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں اور ان کی یہ کوششیں علانیہ ہیں خفیہ

نہیں۔مغربی دباؤ کے پیش نظر پاکستان کا فوجی آمر اس قانون کو بھی غیر موثر بنانا چاہتا تھا چنانچہ غامدی صاحب نے مذکورہ بالامہم میں اسلام کی ایسی تشریحات پیش کیں کہ گویا مذکورہ قوانین میں تبدیلیاں ناگزیر اور وقت کی ضرورت ہیں چنانچہ عوام اور علماء کے احتجاج کے باوجود فوجی قوت سے قانون توہین رسالت کو تبدیل کر دیا گیا[۱۸]۔ اسلامی حوالے سے اس مہم کے روح رواں اور نفس ناطقہ جناب غامدی صاحب ہی تھے۔

ایک شاتمہ رسول (آسیہ مسیح) کو سزا ہوئی تو اس وقت کے گورنر پنجاب سلیمان تاثیر صاحب نے اس کی علانیہ حمایت کی، قانون توہین رسالت کو ظالمانہ اور کالا قانون کہا اور شاتمہ کو بچانے کی کوششیں کیں تو مسلمانوں میں اشتعال پھیل گیا اور گورنر صاحب کے ایک گارڈ نے اسے قتل کر دیا۔اس پر اہل مغرب نے اس قانون کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا اور پاکستان کے سیکولر حلقوں نے بھی مغربی مطالبات کی حمایت شروع کر دی۔ جاوید غامدی صاحب اور ان کے تتبع میں ان کے شاگرد رشید جناب عمار ناصر صاحب نے اس موقع پر ان حلقوں کی حمایت کی اور یہ علمی نکتہ نکالا کہ احناف کا مؤقف تو یہ ہے کہ توہین رسالت ارتداد کے مثل ہے اور مرتد کو توبہ اور معافی کا موقع دیا جاتا ہے لہٰذا قانون توہین رسالت کو جس میں توہین رسالت کی سزا صرف موت ہے، تبدیل کیا جائے اور اس میں کم سزا اور معافی کی گنجائش پیدا کی جائے۔

جاوید غامدی صاحب کی طرف سے توہین رسالت

جاوید غامدی صاحب نے اپنی کتاب 'برہان' میں رجم پر بحث کرتے ہوئے متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہونے والے اور مسلمان اہل علم کے اس اجماعی مؤقف کی کہ زانی محصن کی سزا رجم اور غیر محصن کی سزا سو کوڑے ہے اور جہاں سورہ نور کی آیت ۲ کی وضاحت میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہاں زانی سے مراد زانیٔ غیر محصن ہے، پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہم پورے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان کے اسالیب بیان میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔لغت قرآن سے واقف کوئی شخص اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ 'اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِی' کے الفاظ سے محض کنوارا زانی اور کنواری زانیہ بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔آیت کے الفاظ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ جملے کی ترکیب وتالیف اس سے ابا کرتی ہے۔کلام کے سیاق وسباق کو اسے قبول کرنے سے انکار ہے۔ عرف وعادت کی دلالت کی بنا پر اسے متکلم کا منشا قرار نہیں دیا جاسکتا۔قاضی عقل بالصراحت اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے۔غرض کسی لحاظ سے اسے قرآن مجید کے مدعا کی شرح وتبیین قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ اگر شرح ہے تو پھر بیل سے گھوڑا مراد لیا جاسکتا ہے۔ زمین کا لفظ آسمان کے معنی میں بولا

جاسکتا ہے۔ثریا سے ثریٰ کا مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے۔آفتاب ماہ کا ہم معنی ہوسکتا ہے اور نور کو ظلمت کے محل میں استعمال کر سکتے ہیں''۔ یہ مقام اشتعال انگیز ہے اور کئی لوگ اسے توہین رسالت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یہ جاوید صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے مخالفین میں سے کسی نے آج تک اس بات کو نہیں اچھالا اور انہیں توہین رسالت کے جرم میں عدالت میں نہیں گھسیٹا۔

سزائے موت کا خاتمہ

مغربی فکر میں ہیومنزم وغیرہ کی رو سے چونکہ تقدیس فرد کو حاصل ہے اس لیے وہاں کے فلسفۂ قانون کے تحت ہمدردی کا مستحق مجرم (فرد) ہے نہ کہ سوسائٹی۔اس کے برعکس اسلام کے فلسفۂ جرم و سزا کے مطابق فرد اگر معاشرے کے امن کو غارت کرتا ہے تو اسے کوئی تقدیس حاصل نہیں بلکہ اسے سخت سزا ملنی چاہیے تا کہ معاشرے کا امن و امان غارت نہ ہولیکن غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر محض مغرب سے فکری مرعوبیت کی وجہ سے ہر اس تصور کی حمایت کرتا ہے جو مغرب سے آئے۔ چنانچہ غامدی صاحب اسلام کے فلسفۂ جرم وسزا کی نئی تاویل کرتے ہیں اور موت کی سزا کو محدود کرنے کی غرض سے سورۃ مائدہ کی آیت 32 کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو جمہور امت اور علماء کے خلاف ہے اور سزائے موت کو قتل اور فساد فی الارض تک محدود کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ''اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان دو جرائم کو چھوڑ کر، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے''(۱۹)

یہی وجہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی موجودہ سیکولر اور کرپٹ حکومت (جو کرپشن ہضم کرنے والے قانون NRO کے نتیجے میں وجود میں آئی اور جس کی ڈیل امریکہ نے پیپلز پارٹی اور فوجی آمر میں کروائی) اور جو مغربی حکومتوں کے دباؤ پر سزائے موت کا قانون ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے،اسے اس معاملے میں غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر کی تائید حاصل ہے۔ بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے تو اس کی حمایت کر بھی دی ہے جس کے غامدی صاحب نہ صرف رکن ہیں بلکہ ان کا حلقۂ فکر ہی وہاں بارسوخ اور مقتدر ہے۔

معاشرت

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ ہیومنزم اور سیکولرزم نے مغرب میں فرد کی خودمختاری، تقدیس، فرد محوری اور فرد غایتی (Individualism) کا جو تصور ابھارا اس نے فرد کی لامحدود آزادی کو جنم دیا کہ فرد جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔اور جو بھی وہ سوچے اور جو بھی وہ کرے وہ صحیح ہے، اس کی سوچ اور عمل ہی معیار حق ہے۔ معاشرہ، ریاست اور اجتماعی ادارے چونکہ اس فرد کے پیدا کردہ ہیں لہٰذا وہ

بھی اس کے خادم ہیں اور ان کا کام فرد کی خدمت کرنا اور اس کی سوچ اور عمل کو بروئے کار لانے میں اس کی مدد کرنا ہے۔ سطور بالا میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ قانون کے شعبے میں اس (Individualism) کا اظہار کن تصورات کی صورت میں ہوا۔ یہاں ہم یہ دیکھیں گے کہ معاشرت کے شعبے میں ان اصولوں نے کن مزید تصورات کو جنم دیا:

۱۔ حقوق و واجبات میں عورت اور مرد کی مساوات اور عورت کو مرد کے برابر لانے کی سعی، Women Empowerment کے خوبصورت عنوان سے۔

۲۔ عورت اور مرد کے دائرہ کار میں فرق نہ کرنا

۳۔ عورت کی لامحدود جنسی آزادی

ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ انسانی معاشرت سے متعلق یہ مغربی افکار اسلامی تعلیمات کے بالکل متضاد اور الٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ انسان کا خالق ہے لہٰذا اس سے بڑھ کر انسان کی فطرت اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھنے والا کون ہوگا؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق عورت اور مرد کے دائرہ کار میں فرق رکھا۔ لامحدود جنسی آزادی اگرچہ اس نے مرد کو بھی نہیں دی لیکن عورت کا معاملہ مزید نازک تر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تولید کا ذریعہ بنایا ہے لہٰذا مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت کسی ضرورت و مجبوری میں تو شارع دیتا ہے لیکن نسب کی حفاظت کی خاطر عورت کو بیک وقت ایک سے زیادہ مردوں سے نکاح کی اجازت کسی منزّل من اللہ شریعت نے نہیں دی۔ اسی طرح اسلام عورت کے حقوق کا علمبردار اور نگہبان ہے لیکن وہ حقوق و واجبات میں عورت اور مرد کی مساوات کا قائل نہیں بلکہ فیملی یونٹ میں مرد کو انتظامی سربراہ اور بالادست قرار دیتا ہے۔ معاشرت سے متعلق اسلام کی یہ تعلیمات اور یہ نقطۂ نظر معروف و مشہور ہے، قرآن وسنت کی واضح نصوص پر مبنی ہے اور اسلامی معاشرت پچھلے چودہ سو سال سے انہی اصولوں پر قائم چلی آ رہی ہے لیکن غامدی صاحب چونکہ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب و متاثر ہیں اور اسے ہی معیارِ حق اور قابلِ عمل سمجھتے ہیں لہٰذا وہ معاشرت کے باب میں اسلامی احکام کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا مغربی افکار کے مطابق ہو جائیں۔ اس باب میں ان کے اور ان کے تلامذہ کے بعض اجتہادات، جو نصوص قرآن وسنت کی نئی تفہیم وتشریح پر مبنی ہیں، یہ ہیں:

دوپٹہ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں

اسلام پردے اور حیاء کا حکم دیتا ہے اور گھر میں، گھر سے باہر اور محرم و غیر محرم کے سامنے سب حالتوں میں عورت کے لباس کے بارے میں قرآن وسنت نے واضح اور متعین ہدایات دی ہیں جن کے

مطابق عورت کا سارا جسم ستر ہے اور جسم میں ظاہر ہے کہ سر اور بال بھی شامل ہیں لہٰذا پچھلے چودہ سو سال سے مسلم معاشرتی روایت یہ ہے کہ خواتین سر اور سینہ ڈھانپنے کے لیے دوپٹہ استعمال کرتی ہیں لیکن چونکہ یہ اسلوب مغربی فکر اور فیشن کے خلاف ہے اور مغرب اس ''دقیانوسیت'' کو ختم کرنا چاہتا ہے لہٰذا غامدی صاحب فرماتے ہیں'' دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں''(۲۰)

ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کو یہ کہنا کہ دوپٹہ لینا شرعی حکم نہیں ہے اس کو یہ پیغام دینا ہے کہ دوپٹہ غیر ضروری ہے، اگر نہ بھی لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں کیونکہ یہ کوئی شرعی حکم نہیں۔ اہل مغرب کی خواہش کے مطابق مسلم عورت کو بے حیائی سکھانے کا یہ کارگر نسخہ ہے جو غامدی صاحب کے مکتب فکر نے ایجاد کیا ہے۔

عورت کی دیت مرد کے برابر ہے

اسلام نے عورت پر چونکہ معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی بلکہ خود اس کی کفالت بھی مرد کے ذمہ ہے۔ عورت جب بیٹی ہوتی ہے تو باپ کی کفالت میں ہوتی ہے، بیوی ہو تو خاوند اس کا کفیل ہوتا ہے اور ماں ہو تو بیٹے اس کی خدمت کرنا سعادت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن و سنت نے تقسیم دولت کے مختلف مواقع پر اس کا حصہ مرد کے برابر نہیں رکھا جیسے مثلاً وراثت میں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے عورت کی دیت (Blood Money یعنی وہ رقم جو قاتل (اور اس کے حمایتی) مقتول کے ورثاء کو صلح کی صورت میں دیتے ہیں) بھی مرد سے آدھی قرار دی لیکن مغرب کے نظریۂ مساوات مرد و زن سے متاثر ہو کر غامدی صاحب کا اجتہاد یہ ہے کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہونی چاہیے۔ (۲۱)

گواہی میں عورت و مرد کی مساوات

اسلام نے چونکہ عورتوں اور مردوں کا دائرہ کار الگ الگ رکھا اور مردوں کو معاش اور باہر کی دوڑ دھوپ اور عورت کو گھر داری اور پرورش اولاد کی ذمہ داری دی اس لیے اس نے عورت کو تھانے کچہری کے مسائل سے دور رکھنے کی کوشش کی اور اسے مردوں کی طرح گواہ بنانے سے بھی احتراز کیا لیکن غامدی صاحب مغرب کے مساوات مرد و زن کے اصول کی پاسداری کے لیے عورتوں کی گواہی کے اس نظام کی تاویل کرتے اور اسے مردوں کے برابر لانے کا اجتہاد فرماتے ہیں۔ (۲۲)

عورت نکاح خواں ہوسکتی ہے

معاشرت میں انتظامی سربراہی اسلام نے چونکہ مرد کو دی ہے لہٰذا نکاح و طلاق کا اختیار بھی مرد کو دیا کہ وہی ولی بن سکتا ہے اور نکاح پڑھ اور پڑھوا سکتا ہے لیکن غامدی صاحب مغرب کے نظریۂ مساوات مرد و زن کے تحت اجتہاد فرماتے ہیں کہ عورت بھی نکاح پڑھا سکتی ہے۔ (۲۳)

انٹرنیٹ پر مسلم لڑکی لڑکے کی دوستی جائز ہے

اسلام عفت وعصمت اور پاکیزگیٔ کردار کا علمبردار ہے لہٰذا وہ لوگوں کے ذہن وقلب کو پاکیزہ رکھنے کی خاطر فرماتا ہے کہ میں تمہاری آنکھ کی خیانت سے بھی واقف ہوں (۲۴) اور دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی (۲۵) لیکن مغرب میں چونکہ لڑکیوں لڑکوں کو شادی سے پہلے دوستیوں کی بلکہ سب کچھ کرنے کی اجازت ہے اور جدید اسلام میں مغرب کی فکر ومنہج سے مطابقت ضروری ہے لہٰذا غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان کنواری لڑکیوں کو لڑکوں سے انٹرنیٹ پر دوستی کی اجازت ہے، حدود کے اندر رہ کر۔ مطلب یہ کہ شارع نے (اور مقاصد شریعت کے تحفظ کے لیے علماء وفقہاء نے) سدّ ذریعہ کے طور پر اس ضمن میں جتنے بھی احکام دیئے ہیں وہ محض حماقت پر مبنی تھے لہٰذا آج ان احکام پر عمل کرنے کی بجائے مغربی تہذیب کے مقاصد پورے کرنے کے لیے اجتہاداً کنواری مسلمان لڑکیوں کو لڑکوں سے انٹرنیٹ پر دوستی کی اجازت ہونی چاہیے تا کہ مغرب کی فری سیکس سوسائٹی کی شاہراہ کی طرف بڑھنے کے لیے ایک روزن تو کھلے۔

عورت با جماعت نماز کی امام ہوسکتی ہے

اسلام نے اپنے مذکورہ بالا معاشرتی مقاصد کے لیے عورت کو عبادت کی سربراہی سے بھی دور رکھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جو معاشرت قائم کی اس میں عورتوں کو با جماعت نماز کا امام نہیں بنایا، انہیں دن کے وقت مسجدوں میں آنے سے مستثنیٰ رکھا، مسجد میں ان کو مردوں کی صفوں کے پیچھے الگ صفیں بنانے کے لیے کہا، مسجد آتے جاتے راستے کے کنارے پر چلنے کے لیے کہا، امام کے غلطی کرنے پر انہیں اونچی آواز میں بول کر اصلاح کرنے سے منع کیا۔۔۔ لیکن مغرب چونکہ مساوات مرد وزن کا قائل ہے لہٰذا غامدی صاحب اور ان کے حلقۂ فکر کی ترجمانیٔ اسلام یہ ہے کہ عورت بھی نماز با جماعت کی امام ہوسکتی ہے۔ (۲۶)

مسلمان خاتون غیر مسلم سے نکاح کرسکتی ہے

قرآن حکیم نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو مشرکین سے نکاح کرنے سے منع کیا ہے (۲۷) اسی لیے مسلم معاشرہ پچھلے چودہ سو سال سے اس اصول پر کاربند ہے کہ مسلمان مرد کسی مشرکہ عورت سے نکاح نہیں کرتے جب تک وہ ایمان نہ لائے اور مسلمان عورت کسی مشرک مرد سے نکاح نہیں کرتی جب تک وہ ایمان نہ لائے۔ اس کی حکمت واضح ہے کہ بے دین اور مشرک مرد/عورت سے شادی مسلمان مرد/عورت کے لیے غارت گر ایمان وعمل ہوسکتی ہے اور ان کی آخرت برباد کرسکتی ہے۔

قرآن حکیم نے اگرچہ مسلمان مردوں کو ایسی اہل کتاب عورتوں سے شادی کی اجازت دی ہے جو

پاکیزہ کردار کی حامل ہوں (۲۸) لیکن مسلم خواتین کے لیے ایسی اجازت کا ذکر قرآن وسنت میں موجود نہیں۔ اس کی حکمت بھی واضح ہے کہ مرد عورت پر قوام ہوتا ہے اور اپنے دین وایمان کی حفاظت کر سکتا ہے جب کہ عورت کمزور ہوتی ہے، مرد کے زیر اثر ہوتی ہے اور اس کے لیے مرد کے مقابلے میں اپنے دین و ایمان کی حفاظت اور اولاد کی بحیثیت مسلمان تربیت مشکل ہوتی ہے اس لیے مسلم معاشرت میں پچھلے چودہ سو سال سے عمل اس پر ہے کہ مسلمان عورتوں کا نکاح اہل کتاب مردوں سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو بطور سدّ الذریعہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح سے منع کر دیا تھا۔ آج کے بہت سے اہل علم بھی کتابیہ سے نکاح کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ آج کل کی اہل کتاب خواتین فسادِ عقیدہ وعمل (خصوصاً جنسی بگاڑ کے ماحول) کی وجہ سے 'محصنات' کی قرآنی شرط پر پوری نہیں اترتیں۔

لیکن اس سب کے باوجود غامدی صاحب کا مکتب فکر مسلم خواتین کے مشرک مرد سے نکاح کو جائز قرار دیتا ہے چنانچہ ایک مسلم لڑکی کے استفتا دیرکہ کیا وہ ہندو لڑکے سے شادی کرسکتی ہے، غامدی صاحب کے ایک تلمیذ رشید نے جواب دیا'' ہماری رائے میں غیر مسلم کے ساتھ شادی کو ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ قرآن مجید کی واضح ممانعت نہ ہونے کی بناء پر ایسی شادی غیر پسندیدہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں بہر حال آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ شادی کی جائے یا نہ''(۲۹)

عورت اور مرد اکٹھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں

عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ رکھنا اور عورتوں اور مردوں کو مخلوط ہونے سے بچانا مسلمان معاشرت کا وہ اصول ہے جس کی بنیاد قرآن وسنت کے محکم اصولوں پر ہے چنانچہ باجماعت نماز میں نبی کریم ﷺ کا طریقۂ مبارک یہی تھا کہ خواتین مسجد میں مردوں اور بچوں کے پیچھے آخری صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت انسؓ اور ان کے اہل خانہ کو جماعت سے نماز پڑھائی تو حضرت انسؓ کو اپنی دائیں طرف اور ان کی ماں کو اپنے پیچھے کھڑے کیا۔ چنانچہ اسی پر امت پچھلے چودہ سو سال سے عمل کرتی آ رہی ہے کہ خواتین صف میں مردوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوتیں۔ لیکن مغرب کا موقف اسلام کے برعکس یہ ہے کہ عورت مرد ہر لحاظ سے برابر ہیں اور انہیں ساری دینی و معاشرتی سرگرمیوں میں مل کر حصہ لینا چاہیے۔ مغرب کے اس اصول کی رعایت کرتے ہوئے غامدی صاحب کے مکتب فکر نے یہ فتوی دیا ہے کہ عورت اور مرد اکٹھے کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک استفتاء کے جواب میں غامدی صاحب کے ایک تلمیذ رشید نے لکھا'' مرد وعورت برابر کھڑے ہو کر باجماعت یا انفرادی دونوں طرح سے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے دونوں کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا''۔ (۳۰)

متفرق

۱۔منکرین اسلام کو کافر ومشرک کہنا جائز نہیں

'اسلام' لغت کی رو سے نام ہے کسی کے آگے سرتسلیم خم کر دینے کا اور بحیثیت اصطلاح اس سے مراد ہے اللہ اور اس کی ہدایت اور اس کے نازل کردہ دین کے آگے بلا شرط سرتسلیم خم کر دینا۔ جو آدمی اللہ اور اس کی ہدایت کو بلا شرط قبول کرتا ہے وہ 'مسلم' ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ ' کافر' ہے (لغت میں بھی اور اصطلاحاً بھی) چنانچہ الٰہی ہدایت اور حق کا انکار کرنے والے کو خدا اور رسول نے قرآن وسنت میں کافر ہی کہا ہے اور امت بھی چودہ سو سال سے انہیں کافر (یعنی منکر حق و ہدایت) ہی کہتی چلی آ رہی ہے لیکن غامدی صاحب چونکہ اہل مغرب اور ان کی فکر وتہذیب کو بھی حق سمجھتے ہیں (اور اس میں اہل مغرب کے نظریات کے حامی ہندو بھی شامل ہیں کیونکہ انہیں بھی اسلام اور مسلمانوں سے نفرت ہے یعنی الکفر ملة واحدة) لہٰذا غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر اہل کتاب (یہود ونصاری) اور بت پرست ومشرکین (ہنود) کو بھی کافر کہنے پر تیار نہیں۔ اس ضمن میں ان کا مسلک یہ ہے کہ:

'' ہمارے نزدیک مشرک وہ شخص ہے جس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہو۔ چونکہ اب کسی ہندو کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہے لہٰذا اسے منکر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ قرآن کے اس حکم کا اطلاق اس پر کیا جا سکتا ہے''(۳۱)

اسی طرح وہ اہل کتاب کو بھی کافر قرار نہیں دیتے جو نبی کریم ﷺ کی رسالت کے منکر (کافر) ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم مختلف گروہوں کے عمل وعقیدہ کی غلطی واضح کریں اور جو لوگ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے، انہیں بس غیر مسلم سمجھیں اور ان کے کفر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں)''۔ (۳۲)

۲۔داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں

نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ داڑھی رکھیں کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اس میں یہود ونصار کی مخالفت بھی ہے(جو داڑھی منڈواتے ہیں) اور مسلمانوں کی بحیثیت ایک الگ ملت پہچان وانفرادیت بھی ہے۔ نیز یہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ بلکہ جمیع انبیاء کی سنت بھی ہے اور اسی پر امت کا پچھلے چودہ سو سال سے اجماع اور عمل ہے لیکن غامدی صاحب کو چونکہ اسلام کی ایسی

تشریح درکار ہے جس سے اہل مغرب اور ان کی تہذیب کی تائید ہوتی ہو لہٰذا انہوں نے داڑھی کو دین ہی سے خارج کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے 27 سنن کی جو فہرست تیار کی ہے (۳۳) اس میں داڑھی شامل نہیں ہے۔ اور ایک مستفتی کو جس نے داڑھی رکھنے کے بارے میں سوال پوچھا تھا، جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں ''عام طور پر اہل علم داڑھی رکھنا دینی لحاظ سے ضروری قرار دیتے ہیں، تاہم ہمارے نزدیک داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا، لہٰذا دین کی رو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے''۔ (۳۴)

۳۔ موسیقی، تصویر اور مجسمہ سازی جائز ہے

اسلام دین فطرت ہے لہٰذا وہ انسان کے فطری میلانات پر روک نہیں لگاتا البتہ ان کی تہذیب ضرور کرتا ہے تا کہ وہ غلط اور مضر رخ اختیار نہ کریں چنانچہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سنت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ایسا گانا جائز نہیں ہے جس کا مواد (content) مناسب نہ ہو اور نبی کریم ﷺ نے آلات موسیقی کے استعمال سے بھی منع فرمایا کیونکہ یہ انسان کے حیوانی جذبات کو انگیخت کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے انسانوں اور جانداروں کی تصویر سازی سے بھی منع کیا کہ اس سے ان کی تقدیس کے جذبات ابھرتے اور اس کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور اسلام کے تصور توحید کو زک پہنچنے کا احتمال بڑھتا ہے۔ ان احکام کے پیش نظر اور مذکورہ حکمتوں کی بناء پر اور بطور سد الذریعہ جمہور علماء نے ہمیشہ موسیقی اور تصویر سازی کی حوصلہ شکنی کی ہے اور اسی پر امت کے صالح عناصر کا صدیوں سے عمل ہے۔ مسلم تاریخ میں بلا شبہ بعض مسلمان بادشاہوں، امراء اور اہل ہوس کے ہاں رقص و سرود اور ناؤ و نوش کی محفلیں جمتی رہی ہیں لیکن اہل علم وصلاح نے کبھی ان کی تصویب نہیں کی بلکہ اسے منکرات میں شمار کر کے ہمیشہ اس کی مذمت ہی کی ہے۔

اس کے برعکس مغربی تہذیب موسیقی کو روح کی غذا قرار دیتی ہے اور تصویر تو اس تہذیب کی جان ہے اور ان کی تجارت کو آگے بڑھانے کا بنیادی ذریعہ ہے بلکہ سارے شعبہ ہائے زندگی میں تصویر کا کردار اہم ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر مجبور ہے کہ کسی طرح موسیقی اور تصویر سازی کو عین اسلامی ثابت کرے تا کہ لوگ مغربی تہذیب کی پیروی کرتے ہوئے کسی احساس گناہ میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اس سے لطف اندوز ہوں چنانچہ غامدی صاحب کے ایک تلمیذ رشید فرماتے ہیں: (۳۵)

> ''تاہم اس کے باوجود اس (یعنی بائبل) کے اندر پروردگار کی رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ اس کے مندرجات کو اگر اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے تو فلاح انسانی کے لیے اس سے بہت کچھ اخذ واستفادہ کیا جا سکتا ہے

اس کتاب مقدس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا''۔

غامدی صاحب کے ایک دوسرے شاگرد نے تصویر کے موضوع پر تحقیق کی اور تصویر و مجسمہ سازی کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھا:

''لیکن فی نفسہ تصاویر کے بارے میں کسی اعتراض کی کیونکر گنجائش ہوسکتی ہے جبکہ خدا اور اس کے رسول ﷺ نے انہیں جائز رکھا ہو'' (۳۶)

۴۔ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کا حق فائق ہے

جب اہل یورپ نے مسلمانوں کو شکست دے کر مسلم ممالک پر قبضہ کرلیا تو فسلطین و شام پر قبضے کے وقت اس کے مسیحی کمانڈر نے صلاح الدین کی قبر پر ٹھڈے مارتے ہوئے کہا تھا کہ ''اٹھو صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں''۔ پھر استعمار نے دنیا بھر سے یہودیوں کو فسلطین میں لاکر بسانا شروع کیا اور فلسطینیوں کو ان کے ملک سے نکال باہر کیا جو آج بھی دنیا میں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے آج کل غزہ میں محصور ہیں اور اسرائیل وہاں غذائی امداد بھی نہیں پہنچنے دے رہا تا کہ وہ بھوکوں مر جائیں۔ اس سے پہلے صبرہ اور شاتیلہ کے کیمپوں میں جس وحشت اور درندگی سے اسرائیل نے فلسطینیوں کو ذبح کیا اس پر غیر مسلم دنیا بھی چیخ اُٹھی تھی۔ ساری مہذب دنیا اور ساری مسلمان امت مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ ہے لیکن غامدی مکتب فکر کے ممتاز محقق اور الشریعہ کے ایڈیٹر عمار ناصر صاحب نے طویل مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں مسجد اقصیٰ اور صخرہ پر یہودیوں کا حق فائق ہے گویا بیت المقدس یہودیوں ہی کے پاس رہنا چاہیے۔ مظلوم فلسطینی مسلمانوں کے مقابلے میں غاصب اور ظالم یہودیوں کی حمایت پر مبنی یہ ٹھنڈی اور شائستہ تحریر اسی طرح اشتعال انگیز ہے جس طرح غلام احمد قادیانی کی وہ ہدایت جب اس نے اپنے متبعین کو اس وقت قادیان میں چراغاں کرنے کا حکم دیا تھا جب برطانوی فوجوں نے ترکی کے بعض اہم شہروں پر قبضہ کیا تھا کہ ان کی سرپرست اور مہربان حکومت کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

حاصل بحث

سطور بالا میں ہم نے غامدی صاحب اور ان کے رفقاء کے نصوص کی تعبیر و تشریح اور اجتہادات کے نمونے دیکھ لیے۔ ان 'اجتہادات' اور نصوص کی تشریح و تاویل سے جو چیز ایک تسلسل اور اشتراک کے ساتھ متبادر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر کو عین اسلامی ثابت کر

دیا جائے جب کہ اس سے پہلے ہم تفصیل سے یہ بتا چکے ہیں کہ مغربی تہذیب جن بنیادی افکار و نظریات پر کھڑی ہے وہ اپنی اساس اور کنہ میں خلاف اسلام اور مبنی بر کفر و الحاد ہیں، لہٰذا غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کی یہ ساری تشریحات اور یہ سارے 'اجتہادات' ناقابل قبول ہیں۔ یہ اجتہاد نہیں تجدد ہے جو شرعاً مردود ہے۔۔لیکن اس پر مزید بحث کرنے سے پہلے یہ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام کو مغربی تہذیب کے مطابق ڈھالنے یا اس کے مطابق ثابت کرنے کا کام غامدی صاحب کرتے کیسے ہیں یعنی ان کا منہج اور طریق کار کیا ہے؟

دوسری دلیل

غامدی صاحب کا منہج فکر اور طریق استنباط جمہور امت سے الگ اور شاذ ہے

ظاہر ہے اگر غامدی صاحب دین کے مآخذ کو اسی طرح مانیں جس طرح کہ ساری امت اور جمہور مسلمان مانتے ہیں تو وہ یہ ہنر نہیں دکھا سکتے کہ غیر اسلامی مغربی تہذیب کے مظاہر کو عین اسلامی ثابت کر سکیں، لہٰذا انہوں نے ان مآخذ کی تشریح و تعبیر اس طرح کی ہے جو خاص ان کی اپنی ہے، شاذ اور منفرد ہے اور جمہور امت سے مختلف ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے وہ جس چیز کو چاہیں عین اسلامی ثابت کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں اسلام لغت و اصطلاح میں نام ہے اللہ کی غیر شروط اطاعت کا۔ گویا جو اسلام قبول کرتا اور خود کو مسلم کہتا ہے اس کے لیے ہدایت اور زندگی گزارنے کا راستہ صرف وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب اور رسول کے ذریعے بھیجا ہے۔ گویا دین کے بنیادی مآخذ ہیں کتاب و سنت۔ پھر چونکہ حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری رسول قرار دے دیا لہٰذا اللہ نے دین کو ہمیشہ کے لیے قابل عمل رکھنے کی خاطر اپنے پیغمبر کے ذریعے امت کو اجتہاد کی اجازت دے دی تا کہ جن امور میں حکم شرعی صراحتاً موجود نہ ہو وہاں نصوص کی روشنی میں اور شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اہل علم کوئی رائے قائم کر لیں۔ قرآن و سنت کی نصوص کی جن تشریحات اور اجتہادات پر امت کے سارے اہل علم متفق ہو جائیں انہیں اجماع کہا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کا منہج اور طریق استنباط یہ ہے کہ وہ دین و شریعت کے ان تینوں مآخذ یعنی کتاب و سنت اور اجماع کی ایسی تشریح و تاویل کرتے ہیں جو ساری امت اور جمہور علماء سے مختلف ہے لہٰذا ان کے لیے رستہ نکل آتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے افکار و مظاہر کو عین اسلامی ثابت کر سکیں۔

اس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

غامدی صاحب کا 'کتاب وسنت' کا نیا مفہوم

جمہور علماء اور امت 'الکتاب' سے قرآن مجید مراد لیتے ہیں جبکہ غامدی صاحب اس میں سابقہ انبیاء کے صحائف کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ (۳۸) اس موضوع پر غامدی صاحب نے اپنی کتاب 'میزان' میں 'دین کی آخری کتاب' کے حوالے سے جو تحریر لکھی ہے اس کا خلاصہ ان کے تلمیذ خاص مناب منظور الحسن صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں' بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ نے روزِ اوّل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات' زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی اور قرآن مجید نازل ہوا۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے''۔ (۳۹)

قرآن کے ساتھ پہلی کتب سماویہ سے استدلال کے حوالے سے غامدی صاحب کے ایک دوسرے شاگرد جناب طالب محسن صاحب نے لکھا ہے کہ:

''بائبل، تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی کا مجموعہ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ اللہ ہی کی شریعت اور حکمت کا بیان ہے۔ اس کے مختلف حاملین نے اپنے اپنے مذہبی تعصّبات کی بنا پر اگرچہ اس کے بعض اجزاء کو ضائع کر دیا اور بعض میں تحریف کر دی، تاہم اس کے باوجود اس کے اندر پروردگار کی رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ اس کے مندرجات کو اگر اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے تو فلاح انسانی کے لیے اس سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا جا سکتا ہے اس کتاب مقدس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا''۔ (۴۰)

یہی حال 'سنت' رسول ﷺ کا ہے۔ امت اور جمہور علماء سنت سے مراد لیتے ہیں نبی کریم ﷺ

کے اقوال و افعال اور تقاریر۔ غامدی صاحب اس سے اختلاف کرتے ہوئے سنت کو نہ صرف نبی کریمﷺ کے ان اعمال تک محدود کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک صحابہ کرام کے تواتر اور تعامل سے ثابت ہوں (یوں وہ سنت کو 27 اعمال تک محدود کر دیتے ہیں) بلکہ اس میں وہ سابقہ انبیاء کی سنت کو بھی شامل کر دیتے ہیں اور اس شرط پر پوری نہ اترنے والی آنحضرتﷺ کی ہزاروں سنتوں، اقوال اور تقاریر کو خبر واحد قرار دے کر رد کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ ان سے دین ثابت نہیں ہوتا چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریمﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا حکم آپﷺ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے: ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (النحل۱۶:۱۲۳) ''پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا''۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے: (۱) اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا (۲) ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اس کا جواب (۳) چھینک آنے پر 'الحمدللہ' اور اس کے جواب میں 'یرحمک اللہ' (۴) نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت (۵) مونچھیں پست رکھنا (۶) زیر ناف کے بال مونڈنا (۷) بغل کے بال صاف کرنا (۸) لڑکوں کا ختنہ کرنا (۹) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا (۱۰) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی (۱۱) استنجا (۱۲) حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب (۱۳) حیض و نفاس کے بعد غسل (۱۴) غسل جنابت (۵) میت کا غسل (۱۶) تجہیز و تکفین (۱۷) تدفین (۱۸) عید الفطر (۱۹) عید الاضحیٰ (۲۰) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تزکیہ (۲۱) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات (۲۲) زکوٰۃ اور اس کے متعلقات (۲۳) نماز اور اس کے متعلقات (۲۴) روزہ اور صدقۂ فطر (۲۵) اعتکاف (۲۶) قربانی (۲۷) حج و عمرہ اور ان کے متعلقات۔ سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے' لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دین لاریب انہی دو صورتوں میں ہے (یعنی قرآن اور سنت) ان کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔''[۴۱]

''دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے' یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں''[۴۲]

''میرے نزدیک صرف وہی چیزیں سنت کی حیثیت رکھتی ہیں جو صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ہم تک منتقل ہوئی ہوں۔ ہم انہی چیزوں پر اصرار کر سکتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر لوگوں کو توجہ بھی دلا سکتے ہیں۔ جن امور میں صحابہ کرامؓ کا اجماع نہیں ہے انہیں نہ سنت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر عمل کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق رفع یدین بھی ان چیزوں میں شامل ہے جن پر صحابہ کرامؓ کا اجماع نہ ہو سکا' اس وجہ سے میں اسے سنت نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا متفق ہو کر اسے سنت قرار دینے لگے تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔'' (۴۳)

جب کہ امت اور جمہور علماء کرام دین کی ساری تفصیلات اور زندگی کے سارے شعبوں کے ہزاروں اعمال کی سند اس سنت سے لیتے ہیں جو ان کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال و تقاریر پر مشتمل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب غامدی صاحب 'کتاب وسنت' کا وہ مفہوم قبول ہی نہیں کرتے جو امت کرتی ہے اور ان کا 'کتاب وسنت' کا اپنا ایک مخصوص، شاذ، منفرد اور امت سے الگ مفہوم ہے (اور اس مفہوم کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ بائیبل بھی ماخذ احکام ہے، قرآن کی تشریح میں سنت کا کردار محدود ہے۔ سنت میں وہ ہزاروں احکام شامل ہی نہیں جنہیں امت چودہ سو سال سے سنت سمجھتی آئی ہے) تو ظاہر ہے 'کتاب وسنت' کے اپنے اس مفہوم سے وہ جو چاہیں عین اسلامی ثابت کر سکتے ہیں۔

اجماع اور تعامل امت کا انکار

اسی طرح امت اور جمہور علماء کرام نصوص کی ان تشریحات اور اجتہادات پر عمل ضروری سمجھتے ہیں جن پر جمہور اہل علم اور مجتہدین کا اتفاق ہو اور جن پر امت کا توافق و تعامل ہو لیکن غامدی صاحب اس طرح کے اجماع کے خلاف رائے قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے اجماع منزّل من اللہ نہیں ہوتا (اگرچہ بعض اہل علم نصوص پر مبنی احکام پر مجتہدین کے اتفاق کو بھی اجماع قرار دیتے ہیں) بلکہ اہل علم کا کسی اجتہاد یا نص کی کسی خاص تشریح پر اتفاق اور امت کا اس اتفاق کو قبول کر لینا ہے۔ یوں اصولی طور پر اگر اجماع کا تعلق کسی تمدنی یا عرفی معاملے سے ہو تو تغیر زمان و مکان و حالات سے فتویٰ بدل سکتا ہے اور یوں ایک اجماع کے انعقاد کے بعد زمان و مکان اور حالات کے تغیر کے نتیجے میں امت اور اس کے اہل علم کسی دوسری رائے پر بھی اجماع کر سکتے ہیں اور اس دوسرے اجماع پر پہنچنے کے لیے ظاہر ہے اہل علم کو پہلے اجماع کے برعکس اجتہادی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے لیکن یہاں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ:

۔ جب تک ایک اجماع موجود ہو وہ حجت ہوتا ہے یعنی عمل اسی پر ہوگا اور قانون اسی کے مطابق بنے گا نہ کہ کسی انفرادی رائے پر۔

۔ کسی اجماع کے خلاف نئی رائے کو امت اور اس کے اہل علم صرف اسی وقت قابل غور و اعتناء سمجھیں گے جب وہ امت اور جمہور علماء کے تصور دین، علمی مسلمات اور اصول استنباط کے مطابق ہو۔

۔ اگر امت اور جمہور علماء کرام کسی عالم/ سکالر کی اجتہادی رائے کو اس بناء پر رد کر دیں کہ وہ ان کے تصور دین، علمی مسلمات اور اصول استنباط کے خلاف ہے اور کسی غیر اسلامی فکر و تہذیب پر مبنی ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی اور نہ اس پر عمل ہوگا۔

آج امت اور جمہور علماء کرام غامدی صاحب کی آراء کو اس لیے بالاتفاق رد کر رہے ہیں کہ وہ ان کے تصور دین، علمی مسلمات اور اصول استنباط کے خلاف ہیں اور ملحدانہ مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کی موافقت پر مبنی ہیں۔

اجماع کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ۔ اجماع درحقیقت کسی قوم کے علمی، فکری اور تہذیبی تسلسل کی ضمانت ہوتا ہے۔ الحمد للہ! مسلم معاشرہ پچھلے چودہ سو سال سے بلا انقطاع قائم ہے اور دنیا کے ذہین ترین لاکھوں افراد نے اس کی علمی، فکری اور تہذیبی روایت کی آبیاری کی ہے جس پر امت صدیوں سے عمل پیرا ہے۔ جمہور اہل علم قرآن وسنت اور ان سے اخذ و استنباط کے جن اصولوں پر صدیوں سے عمل پیرا ہیں اور جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کی حیثیت اس پہاڑ یا مضبوط قلعے کی ہے جو پانی کے کنارے قائم ہو۔ پانی کی کوئی لہر کبھی بلند ہو کر اس پہاڑ یا قلعے کی دیوار کی طرف جا لپکتی ہے لیکن وہ فوراً ہی ناکام پلٹ آتی ہے۔

کوئی نیا اجتہاد یا نصوص کی کوئی نئی تشریح جو سابقہ اجماع سے مختلف ہو لیکن وقت کی ضرورت ہو اسے اہل علم خود بخود جلد یا بدیر قبول کر لیں گے بشرطیکہ وہ میرٹ پر پوری اترتی ہو یعنی قرآن وسنت اور اس کی تشریح و استنباط کے مسلمہ اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قائم کی گئی ہو۔ لیکن اگر کوئی عالم یا سکالر اس پیراڈائم ہی کو قبول نہ کرے اور قرآن وسنت اور ان کی تشریح و استنباط کے مسلمہ اصولوں کی پاسداری نہ کرے تو جمہور اہل علم اور جمہور امت اسے رد کرنے پر مجبور ہوگی۔ ایسے عالم یا سکالر کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دین آج نازل نہیں ہوا اور نہ اس پر وحی اترتی ہے کہ امت اس کی کسی نئی تشریح کو قبول کر لے۔ صاف بات یہ ہے کہ علمی اصولوں اور روایات کا تسلسل کسی قوم کی فکری زندگی کی حیات کا ضامن ہوتا ہے اور اس کا اس تسلسل کی حفاظت کے لیے مرغی کی طرح پَر پھیلا کر چوزوں کو سمیٹ کر پناہ میں لے لینا اور اسے بیرونی حملہ آور سے بچانے کی کوشش کرنا ایک فطری عمل ہے جو امت کی اجتماعی زندگی کی بقا کا ضامن ہے۔ لہٰذا جمہور علماء اور جمہور امت اگر آج سرسید، قادیانی، پرویز اور غامدی کو رد کرتی ہے (جیسے ماضی میں جمہور علماء اور جمہور امت نے خوارج، معتزلہ، قدریہ،

جہمیہ ۔۔۔وغیرہ کو رد کیا اور ان کا ذکر آج ہم صرف تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں) تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔۔ یہ قوموں کی حفاظت خود اختیاری کا وہ نظام ہے جو ہمیشہ روبہ عمل رہتا ہے اور رہنا چاہیے ـــــ جس طرح آنکھ خود بخود فی الفور اور تیزی سے بند ہو جاتی ہے جب کوئی چیز اس کی طرف بڑھتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ غامدی صاحب نے اپنے عمل سے اجماع کی حجیت کا تو گویا انکار ہی کر دیا ہے اور ان کے تلامذہ اس کا علی الاعلان تحریری انکار کرتے ہیں جیسے ان کے تلمیذ رشید جناب عمار ناصر صاحب کا مؤقف ہے: (۴۴)

یہ تجدد اور احداث فی الدین ہے اور قابل رد ہے

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ:

۱۔ جاوید غامدی صاحب کا تصور کتاب وسنت وہ نہیں جو جمہور امت اور جمہور علماء کا ہے

۲۔ وہ مسلمانوں کے چودہ سوسالہ علمی مسلمات اور تعامل (اجماع) کو اہمیت دینے کو تیار نہیں

یوں جب ان کا تصور دین، علمی مسلمات اور منہج استنباط یا یوں کہیے کہ پورا پیراڈائم ہی اس سے مختلف ہو گیا تو اب وہ جس چیز کو چاہیں دین قرار دے سکتے ہیں اور جسے چاہیں دین سے خارج کر سکتے ہیں اور خصوصاً مغربی تہذیب کی جس چیز کو چاہیں عین اسلامی ثابت کر سکتے ہیں اور اسلامی اصول و احکام کو مغربی فکر وتہذیب کے عین مطابق ثابت کر سکتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے ان کی آراء کو قابل قبول اجتہاد قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ہم مجبور ہیں کہ ان کی آراء کو تجدد کہیں کہ تجدد کہتے ہی اس کو ہیں کہ کسی غیر اسلامی فکر، تصور اور مظہر کو مصنوعی طور پر اور بتکلف اسلام کے مطابق ثابت کیا جائے یعنی غیر اسلام کو عین اسلام ثابت کیا جائے۔ شرعی اصطلاح میں اسی کو احداث فی الدین اور بدعت کہا جاتا ہے جن کے بارے میں شرعی حکم واضح ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

- ''من احدث فی امرنا ھذا لیس منہ فھو رد''(۴۵)

جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اصلاً اس میں نہ ہو تو وہ مردود ہے یعنی وہ رد کر دی جائے گی۔

- ''کل محدثۃ بدعۃ و کل بدعۃ ضلالۃ''(۴۶)

دین میں ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت کا نتیجہ گمراہی ہے۔

- ''و کل ضلالۃ فی النار''(۴۷)

اور ہر گمراہی کا نتیجہ جہنم ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے یہ بھی واضح ہے کہ احداث فی الدین کا مرتکب روز قیامت آپ ﷺ کی شفاعت سے محروم رہے گا اور آپ ﷺ حوض کوثر پر اسے خود سے دور کر دیں گے اور فرشتے اسے کھینچ کر جہنم میں لے جائیں گے۔ (۴۸) اسی لیے صالح علماء ہمیشہ احداث فی الدین سے بچنے کی دعا اور کوشش کرتے رہتے ہیں۔

کتابیات

اس تفصیل سے غامدی صاحب کے افکار اور ان کا منہج واضح ہو جاتا ہے۔ ہمارے پیش نظر کتاب لکھنا نہیں محض ایک مضمون لکھنا تھا لہٰذا ہم تفصیلات میں نہیں گئے۔ جو اصحاب اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں انہیں چاہیے کہ مندرجہ ذیل کتب دیکھ لیں:

۱۔ حافظ محمد زبیر و حافظ طاہر اسلام عسکری، فکر غامدی، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور ۲۰۰۷ء

۲۔ مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، غامدی مذہب کیا ہے؟ مکتبہ قرآنیات لاہور ۲۰۰۷ء

۳۔ مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد (جامعہ مدنیہ، لاہور)، تحفہ غامدی، لاہور ۲۰۰۷ء

۴۔ مولانا عبدالرحیم، غامدیت کیا ہے؟ جامعہ حنفیہ، امداد ٹاؤن شیخوپورہ، ۲۰۱۱ء (اس کتاب پر ملک بھر کے جید علماء بالخصوص مولانا مفتی زرولی خان (کراچی)، مولانا عبدالقدوس ترمذی (ساہیوال)، مولانا محمد ازہر (ملتان)، مولانا مفتی محمد عیسی (گوجرانوالہ)، مولانا عبدالرحیم (جھنگ)، مولانا یوسف الحسینی (بہاولپور)، مولانا عبدالرؤف چشتی (اوکاڑہ)، مولانا قاضی ظہور حسین اطہر اور مولانا سعید احمد جلالپوری کی تائیدی تقاریظ موجود ہیں)۔

۵۔ مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، جاوید غامدی اور انکار حدیث، مکتبہ قرآنیات، لاہور

۶۔ مولانا پروفیسر محمد رفیق چودھری، فتنہ غامدیت کا علمی محاسبہ، مکتبہ قرآنیات، لاہور

۷۔ حافظ محمد زبیر، غامدی صاحب کے اصول دین کا علمی و تحقیقی مطالعہ، ادارہ تحفظ حدیث فاؤنڈیشن، کراچی

نیز دیکھیے جرائد میں سے ماہنامہ محدث (لاہور)، ماہنامہ بیداری (حیدرآباد)، ماہنامہ صفدر (گجرات)، ماہنامہ القاسم (خالق آباد، نوشہرہ) اور ماہنامہ الشریعہ (گوجرانوالہ)۔ ویب سائٹس کے لیے دیکھیے: www.endofprophethood.com, www.kitabosunnat.com, www.difaehadees.com اور www.al-mawrid.org

اس مؤقف پر ممکنہ اعتراضات کا جواب

غامدی صاحب کے نظریات کے بارے میں جمہور علماء کرام کے مؤقف کے حوالے سے ہمارے اس

اظہارِ خیال پر غامدی صاحب، ان کے پیروکاروں اور بعض قارئین کے جو ممکنہ اعتراضات ہو سکتے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کر کے ہم یہاں ان کا جواب دیں گے تا کہ مسئلہ قارئین پر مزید واضح ہو جائے:

۱۔ علماء علمی اختلاف رائے برداشت نہیں کرتے

غامدی صاحب اپنی تقریر و تحریر میں عموماً اپنی بات سنجیدگی، متانت اور شائستگی سے کرتے ہیں اور عقلی استدلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ ساتھ ہر بات میں قرآن و سنت کے حوالے بھی دیتے ہیں لہٰذا ان کے قارئین و سامعین ان سے متاثر ہوتے ہیں اور انہیں سمجھ نہیں آتی کہ علماء کرام غامدی صاحب کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ تو محض بعض معاملات میں پہلے لوگوں سے علمی اختلاف کرتے ہیں اور ظاہر ہے زمانہ اور حالات بدل جانے کی وجہ سے یہ چیز قابل مذمت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دراصل علماء میں اختلاف رائے برداشت کرنے کی عادت نہیں اور صدیوں کے تقلید و جمود نے انہیں متجدد بنا دیا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ بلاشبہ یہ امر جائز ہے کہ آج کوئی عالم ماضی کے اہل علم سے اختلاف کرے یا تفہیم نصوص میں ان کی آراء سے مختلف کوئی رائے ظاہر کرے بلکہ ہم بطور اصول اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ماضی کے اجماع کے برعکس آج کوئی نیا اجماع بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ 'الحکم یدور مع العلة' اور یہ عین ممکن ہے کہ اگر علت کی بنیاد فقہ واقعی پر ہو یعنی کسی مخصوص عہد یا مخصوص حالات و واقعات سے ہو تو بعد میں اجتہادی حکم بدل جائے گا جس کی مثال نویں صدی ہجری کے حنبلی فقیہ امام جزری کی ہے کہ انہوں نے فتویٰ دیا کہ گھر میں کتا رکھنا جائز ہے۔ سائل نے اعتراض کیا کہ امام احمد کا فتویٰ تو یہ ہے کہ گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں۔ انہوں نے کہا میاں! اس وقت حالات اور تھے۔ آج امن و امان کی جو حالت ہے اور چوریوں ڈاکوں کی جو کثرت ہے، اگر امام احمد بن حنبلؒ آج زندہ ہوتے تو کتا چھوڑ گھر میں شیر پالنے کی اجازت دیتے۔ (۴۹)

اجتہادی احکام میں اس طرح کی تبدیلی مسلمان اہل علم کے ہاں کبھی مردود نہیں رہی اور یہی حریت فکر اسلام میں توسع اور اس کے ہمیشہ قابل عمل رہنے کی ضمانت ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا اس آزادی کا حق دار وہ ہے جو پیراڈائم کے اندر رہے، جو گیم کے اصولوں کو تسلیم کرے اور اس کے بعد کھیل میں مزید بہتری لانے کے لیے، اور اس کے قواعد و ضوابط میں کمی بیشی کے لیے تجاویز دے تو اس کھیل سے متعلق لوگ اس کی باتوں کو غور سے سنیں گے اور ان میں سے بعض کو وہ قبول بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص کھیل میں ایسی بنیادی تبدیلیاں تجویز کرے جس سے اس کھیل کی شکل ہی بدل

جائے تو اس کی تجاویز کو منطقی طور پر سب لوگ رد کر دیں گے۔ مثلاً اگر کوئی صاحب کرکٹ کی منتظم ایسوسی ایشن کو تجویز دے کہ کرکٹ کی گیند کا رنگ سفید نہیں سرخ ہونا چاہیے اور اس کا یہ اور یہ فائدہ ہے تو اغلب ہے کہ منتظمین اس کی بات پر غور کریں اور تجویز انہیں مفید و مناسب لگے تو مان بھی لیں۔ لیکن اگر کوئی کرکٹ ایسوسی ایشن کو یہ تجویز دے کہ کرکٹ کی بال چھوٹی اور ٹھوس نہیں بلکہ بڑی ہونی چاہیے اور اس میں ہوا بھری ہونی چاہیے تو منطقی طور پر اہل کرکٹ اسے تسلیم نہیں کریں گے اور اسے کہیں گے جاؤ میاں! یہ کرکٹ ہے فٹ بال نہیں۔ جب آپ کرکٹ کھیلنے والوں کو فٹ بال والی تجویز دیتے ہیں تو گویا آپ کرکٹ کی پیراڈائم سے نکل جاتے ہیں اور کرکٹ کے بنیادی اصولوں کی مخالفت کرتے ہیں تو لازماً اہل کرکٹ آپ کی بات نہیں مانیں گے۔

غامدی صاحب کے ساتھ مسئلہ یہی ہے کہ اگر وہ پیراڈائم کے اندر رہتے ہوئے اور کھیل کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی بات کرتے تو لوگ ان کی آراء پر غور کرتے اور مفید ہوتیں تو مان بھی لیتے لیکن جب وہ بنیادی اصولوں سے اختلاف کرتے ہیں تو علماء مجبوراً ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ دیکھیے! امت پچھلے چودہ سو سال سے قرآن وسنت کو دین کا بنیادی مآخذ مانتی آئی ہے۔ غامدی صاحب کہتے ہیں نہیں کچھ مآخذ اور بھی ہیں۔ امت کہتی ہے کہ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے وہ کہتے ہیں نہیں اس میں پچھلی کتابیں بھی شامل ہیں۔ امت کہتی ہے سنت نام ہے نبی کریم ﷺ کے قول وفعل وتقریر کا۔ وہ کہتے ہیں نہیں سنت نام ہے صرف ان افعال رسول ﷺ کا جو اجماع صحابہ سے ثابت ہیں، باقی رہیں احادیث تو وہ محض خبر واحد ہیں ان سے تو دین ثابت ہی نہیں ہوتا۔ امت نے چودہ سو سال کے فہم دین اور تعامل سے کچھ اصول واقدار بنا رکھی ہیں، لیکن غامدی صاحب ان سے اختلاف کرتے ہوئے کرکٹ کھیلنے والوں سے کہتے ہیں کہ فٹ بال سے کرکٹ کھیلو۔ امت ان کی یہ بات کیسے مانے اور کیوں مانے؟ وہ تو ان کے پیراڈائم سے ہی نکل گئے، انہوں نے تو کھیل کی بنیادیں ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا ان کی بات اب کوئی نہیں سنے گا اور عقل ومنطق کا تقاضا ہے کہ نہ سنی جائے۔

جمہور علماء اگر غامدی صاحب کو گمراہ سمجھتے ہیں (اور بعض مفتی صاحبان تو ان کے ارتداد کا فتویٰ بھی دے رہے ہیں) تو ان کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ غامدی صاحب ان کے پیراڈائم سے باہر نکل کر بات کر رہے ہیں اور کھیل کے بنیادی اصولوں کی نفی کر رہے ہیں لہٰذا جمہور امت ان کے نئے نئے اجتہادات اور قرآن وسنت کی اجنبی تشریحات کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ وہ بجا طور پر انہیں سرسید، قادیانی اور پرویز کی قبیل کا فرد سمجھنے پر مجبور ہیں اور یہ منطقی نتیجہ ہے غامدی صاحب کے منہج وموقف کا۔

ہمیں افسوس ہے کہ جاوید غامدی صاحب آج کل جلاوطن ہیں لیکن ان کی جلاوطنی میں عام علماء کرام کے اختلاف رائے برداشت نہ کرنے کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ افغانیوں کے امریکہ کے خلاف جہاد کو جہاد نہیں سمجھتے بلکہ اسے فساد کہتے ہیں۔اس لیے افغان مجاہدین اور ان کے حامی پاکستانی مجاہدین انہیں امریکہ کا حامی اور ایجنٹ سمجھ کر برداشت نہیں کرتے جب کہ ہماری رائے میں یہ بھی صحیح نہیں ہے اور اختلافی نقطۂ نظر کو برداشت کرنا چاہیے۔

۲۔دوسری تہذیبوں سے اخذ واستفادہ گناہ تو نہیں

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا غامدی صاحب کو متجدد کہنے کی اساس دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ وہ اسلامی نصوص کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو مغربی تہذیب کے مظاہر کو قبول کرے اور دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں کفر والحاد پر استوار ہیں۔اس کے جواب میں غامدی صاحب کا مکتب فکر یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک زندہ تہذیب بسا اوقات دوسری تہذیبوں سے تعامل کے نتیجے میں ان کی کوئی چیز قبول کر لیتی ہے تو اسے برا کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی فطرت ہے اور معاشرے ایک دوسرے سے کٹ کر بند ڈبوں کی طرح تو نہیں رہ سکتے؟

ہم ان کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی معاشرے ہوا بند ڈبوں میں قید نہیں ہوتے کہ دوسروں سے ان کا میل جول نہ ہو اور وہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں لیکن ہر تہذیب اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے اور یہ انفرادیت اسے اس کا مخصوص نظریۂ حیات فراہم کرتا ہے۔ایک تہذیب اپنے فکری پیراڈائم پر قائم رہتے ہوئے دوسری تہذیبوں سے تعامل کے نتیجے میں اگر ان کی کوئی مفید چیز لینا چاہتی ہے تو وہ پہلے اسے اپنے فکری سانچے میں ڈھال کر اس کی تہذیب اور کتر بیونت کر کے اسے اپنے لیے قابل قبول بناتی ہے۔پھر ہی اس کا معدہ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے ورنہ اسے باہر اُگل دیتا ہے۔مغربی تہذیب بلاشبہ ایک انسانی تہذیب ہے اور اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور اسلامی تہذیب اپنی فکری اساسات پر قائم رہتے ہوئے اس کی کچھ مفید باتیں لے بھی سکتی ہے لیکن یہاں دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے:

- ایک یہ کہ اسلامی تہذیب کے علمبردار اپنے تہذیبی پیراڈائم پر قائم رہتے ہوئے کسی دوسری تہذیب کے انسانی تجربات سے فائدہ اٹھا لیں اور اس تہذیب کے کسی ادارے (Institution) یا مظہر کو اس طرح قبول کریں کہ پہلے اسے اپنے فکری مزاج اور ضروریات کے مطابق ڈھال لیں اور پھر اپنی تہذیب کا حصہ بنا لیں ـــ یہ چیز قابل قبول ہے جیسے مثلاً حضرت عمرؓ نے دیوان کا تصور یا

ادارہ ایرانی تہذیب سے لیا اور اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیا۔

- دوسرے یہ کہ آپ کی اپنی تہذیب مغلوب ہو اور کوئی دوسری ایسی تہذیب غالب ہو جس کی فکری اساسات آپ کی تہذیب سے مختلف و متضاد ہوں اور آپ اس دوسری تہذیب سے مرعوب و متاثر ہو کر اس کے بعض اداروں اور تصورات کو اپنانے کے لیے اپنی تہذیب کی فکری اساسات کی ایسی تشریح و تعبیر کریں کہ وہ اس غیر اور متضاد تہذیب کے اداروں کو قبول کر لے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلوب نا قابل قبول ہے۔

لہٰذا واضح ہو گیا کہ ہم مغربی تہذیب سے محتاط استفادے سے انکار نہیں کر رہے بلکہ جس وجہ سے غامدی صاحب کے اسلوب کو تجدد کہہ کر رد کر رہے ہیں وہ مذکورہ بالا دوسرے منہج و اسلوب کی بناء پر کر رہے ہیں اور اس لیے کر رہے ہیں کہ اگر ہم یہ نہ کریں تو گویا ہم اپنی تہذیب کو خراب اور برباد ہوتے ہوئے دیکھیں اور خاموش رہیں جو کہ کسی بھی زندہ تہذیب کا سچا پیروکار نہیں کرے گا۔

۳۔نیت پر حملہ

غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کو اکثر شکایت رہتی ہے کہ لوگ دلیل اور شائستگی کے ساتھ ان کے ساتھ مناقشہ نہیں کرتے بلکہ اکثر لوگ فوراً جذباتی ہو جاتے ہیں، الزامات پر اتر آتے ہیں اور نیت پر حملے شروع کر دیتے ہیں حالانکہ نیت ایک ایسا معاملہ ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے اور کوئی کسی کا سینہ چیر کر اسے دیکھ نہیں سکتا۔

اگرچہ یہ ایک معروضی حقیقت ہے کہ دین ہر فرد کے لیے ایک جذباتی معاملہ ہوتا ہے اور ہر فرد صرف اپنی رائے اور عقیدے ہی کو صحیح سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کچھ سننے پر آمادہ نہیں ہوتا تاہم غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر کا یہ اصرار بجا ہے کہ بحث ٹھنڈے دل و دماغ اور استدلال کے ساتھ ہونی چاہیے اور اس میں جذباتیت سے پرہیز کرنا چاہیے۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ نیت پر حملہ نہیں ہونا چاہیے تو ہم عرض کریں گے کہ بلاشبہ کسی کی نیت سے صرف اللہ ہی واقف ہوتا ہے لیکن اہل علم کے نزدیک یہ بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کسی شخص کے افعال و اعمال اس کی نیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص جب اذان سن کر وضو کرتا اور نماز باجماعت میں شریک ہونے کے لیے مسجد میں پہنچ جاتا ہے اور تکبیر تحریمہ سن کر نماز باجماعت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ نماز کی نیت کے الفاظ نہ بھی زبان سے دہرائے تو علماء اس میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کیونکہ اس کے افعال گواہی دے رہے ہوتے ہیں کہ وہ اس وقت کی نماز باجماعت ادا کرنے کھڑا ہوا ہے۔ اسی طرح ہم نے غامدی صاحب کے اجتہادات میں سے ایک

ایک کا تجزیہ کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ ہر معاملے میں مغربی تہذیب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی نصوص کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے مغربی تہذیب کی تائید وتوثیق ہو۔اسی طرح ہم نے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ دین کی بنیادی اصطلاحات وافکار کے غامدی صاحب وہ معنی لیتے ہیں جو جمہور امت نہیں لیتی تو اب ان دلائل سے یہ بالکل واضح ہے کہ غامدی صاحب کا رویہ تجدد پر مبنی ہے اور احداث فی الدین کے مترادف ہے لہٰذا انہیں متجدد کہنا نہ تو ان پر کوئی جذباتی الزام تراشی ہے اور نہ ان کی نیت پر حملہ کرنا ہے بلکہ ہمارے نزدیک یہ محض ایک امر واقعہ کا اظہار ہے۔

ہم نے اس موضوع پر قلم کیوں اٹھایا ہے؟

ا۔ بعض لوگوں کے لیے ہماری یہ تحریر خلاف توقع ہوسکتی ہے۔جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے بعض سمجھتے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کا رویہ سخت ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف تکفیر اور گمراہی کے فتوے لگاتے رہتے ہیں اور وہ ہماری اس تحریر کو بھی اسی رویے کا شاخسانہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نیم خواندہ جذباتی مولویوں کا طریق کار ہے۔ہم اس کے جواب میں وہی بات کہیں گے جو اقبال نے کہی تھی جب اسے قادیانیت کے خلاف بیان دینے پر نہرو نے طنزاً کہا تھا کہ ہم تو اقبال کو مغرب کا تعلیم یافتہ اور لبرل سمجھتے تھے۔ یہ تو مولویوں کی طرح انتہاپسند اور کٹھ ملا نکلا کہ ہاں! میں اس معاملے میں سخت ہوں اور لچک کا مظاہرہ نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ میری امت کی بقاء کا مسئلہ ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ امت پر یہ وقت بہت نازک ہے۔ہم نے یونان کا فکری حملہ جھیل لیا تھا بلکہ یہاں تک کہ ہم نے وحشی منگولوں کا حملہ بھی جھیل لیا تھا کہ اس وقت ہماری تہذیب غالب تھی لہٰذا ہم نے ان حملوں کو پسپا کردیا لیکن آج ہماری تہذیب مغلوب ہے، ہم زوال کے گڑھے سے نکلنے کی کوشش کررہے ہیں ۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو اپنی تہذیب پر فخر کرنا سکھائیں، اپنی فکر پر ان کا اعتماد بحال کریں۔پچھلی دو تین صدیوں کی غلامی اور مغرب کی چکاچوند نے ان کی آنکھوں کو جوخیرہ کررکھا ہے اور ان کے اذہان کو مرعوب اور قلوب کو مردہ کررکھا ہے، اس کیفیت سے انہیں نکالیں۔آج ہمیں ایسے اہل علم کی ضرورت نہیں جو ہمیں مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت سکھائیں اور اسلام کی ایسی تشریح وتاویل اور کتر بیونت کریں جس سے مغرب کی فکر وتہذیب کا چولہ اسلام کے جسم پر فٹ آجائے۔

معاف کیجیے گا۔یہ دشمن بہت خطرناک اور عیار ہے یہ اپنی مہیب جنگی مشینری سے صرف علاقے فتح نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس اذہان وقلوب کو مسخر کرنے کے جدید، پُرامن اور وسیع ترین ذرائع ہیں اور وہ بڑی حکمت اور عیاری سے اپنے کارڈ کھیل رہا ہے۔قرآن کا نیا اور جعلی ایڈیشن تیار کر کے ساری دنیا

میں پھیلا رہا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں سے رسول کی محبت مٹانے کے لیے کارٹون، فلمیں، کتابیں، رسالے اور اخبار شائع کر رہا ہے۔ وہ مسلمان ممالک کے حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنا کر ان کے نظام تعلیم، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا، ادب اور ذہن سازی کے دیگر ذرائع میں سرنگ لگا کر اسلام کے خلاف شکوک وشبہات کی فضاء پیدا کرتا، اسے ناقابل عمل بتاتا، اسے انسانی وقار کے منافی قرار دیتا اور اسے انتہاپسندی اور دہشت گردی باور کرا رہا ہے۔ وہ امت مسلمہ کو جہالت اور افلاس کے گڑھوں سے نہ نکلنے دینے پر پورا زور صرف کر رہا ہے۔ جس ریاست میں اسلام جڑ پکڑنے لگتا ہے وہ زبردستی اس کی تخریب پر اتر آتا ہے (افغانوں کا اصل قصور یہی تھا) غرض وہ اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن سامنے لانا چاہتا ہے جو مغربی فکر وتہذیب کی بالادستی کو قبول کرے، جو مغرب کی فکری غلامی پر قانع رہے لہٰذا اسے ایسے علماء اور سکالرز درکار ہیں جو اس کی یہ ضرورت پوری کریں۔ ان حالات میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج دین کا جو عالم ہمیں حیلے بہانے مغربی فکر وتہذیب کو اپنانے پر اکساتا ہے، اسے اسلامی قرار دیتا ہے، وہ اگر مخلص ہے تو نادان دوست ہے اور اگر اپنے ذاتی مفاد کے لیے کر رہا ہے تو میر جعفر و صادق کے قبیلے کا فرد ہے۔ ہم اس کی حمایت نہیں کر سکتے اور ہماری بقاء کا تقاضا ہے کہ ہم اس کا پول کھولیں اور اس کی اصلیت لوگوں کو بتائیں۔

۲۔ ہمارے بعض دوست کہیں گے کہ ہم نے ملی مجلس شرعی کا ڈول ڈالا ہوا ہے۔ ہم اتحاد امت اور اتحاد بین العلماء کے داعی ہیں۔ تکفیر و تضلیل کے رویے کے مخالف ہیں اور علماء کرام میں تحمل اور اختلاف رائے برداشت کرنے کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں تو خود غامدی صاحب کے ساتھ اختلاف رائے پر خاموش کیوں نہیں رہے؟ ہم عرض کریں گے کہ واقعی ہم ان باتوں کے لیے کوشاں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ ہم صحیح اور غلط میں امتیاز کھو بیٹھیں اور غلط کو صحیح کہنا شروع کر دیں یا غلط اور صحیح میں مساوات قائم کر دیں۔ ہم دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا رویہ علمی لحاظ سے غلط اور مخدوش ہے اور وہ امت کے لیے نقصان دہ ہے اور اپنے اس مؤقف کے لیے ہم نے دلائل دیے ہیں اور اپنی بات شائستگی سے کہنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے غامدی صاحب اور ان کے رفقاء ہماری باتوں پر ہمدردی سے غور فرمائیں گے۔ باقی، ہم اس بات کو کوئی مہم نہیں بنا رہے کہ اسی پر لکھتے رہیں اور البرہان اسی کام میں لگا رہے۔ ہم نے اپنی رائے اہل علم اور قارئین کے سامنے رکھنا تھی وہ رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں شیطان اور نفس کے شر سے بچائے اور ہم سے وہ کام لے جو اسے پسند ہو اور اس کے دین اور اس کے رسول (ﷺ) کی امت کے لیے مفید ہو۔ آمین یارب العالمین۔

حوالہ جات

1۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے ہندوستان میں پادریوں کی ناکامی کے بعد لارڈ میکالے کی تعلیمی رپورٹ: علامہ شبیر بخاری، میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، صفحہ ۴۷، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۸۶ء

2۔ **الحجر ۱۵ :۹**

3۔ **سبا ۳۴:۲۸**

4۔ **البقرہ ۲: ۱۴۳**

5۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبہ

6۔ **سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم ، باب مایذ کر فی قرن المائۃو شمس الحق عظیم آبادی،** عون المعبود، جلد ۴ صفحہ ۱۸۰، نشر السنۃ ملتان، ۱۳۹۹ھ

7۔ **البقرہ ۲: ۷۵**

8۔ یہاں ہم نے ان نظریات کے خلاصے پر اکتفا کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'اسلام اور تزکیہ نفس' (مطبوعہ اردو سائنس بورڈ لاہور) صفحہ ۲۴۳ تا ۲۶۹۔ ان ازموں کے براہ راست تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے:

Ralph Barton Perry, *The Humanity of Man* (New York; George Braziller, 1956), 5-6

D.R. Bhandari, *History of European Political Philosophy* (Banglore: Bangalore Press, 1956)

J. Brodouuski, *The Western Intellectual Tradition* (New York, Harper & Brothers Publishers, 1960)

Laurice Carlin, *The Empiricism: A Guide for the Perplexed* (London: Continum International Publishing Group, 2009), 20-56

John Herman Randall, *Making of the Modern Mind: A Survey of the Intellectual Background of the Present* New York: Columbia University Press 1976)

J. A.Schumpeter, *The Theory of Economic Development* (Cambridge: Harward University Press, 1959), 122

Max Weber, *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism* (London: Univen University Brooks, 1974)

Syed Muhammad Naquib al-Attas, *Islam, Secularism and the Philosophy of Future* (London: Mansell Publishing Limited, 1985), 14

Nikkie R. Keddie, *"Secularism and its Discontents" Daedalus* 132, no.3 (Summer, 2003): 14

Owen Shadwick, *The Secularization of the European Mind in the Nineteenth Century* (Cambridge: Cambridge University Press, 1975), 18

Harry Elmer Barness, *An Intellectual and Cultural History of the Western World*, Vol. 2

9۔ ماہنامہ 'اشراق' لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۶ء ص ۶۱

10۔ ماہنامہ چراغ راہ کراچی، شمارہ جون ۱۹۵۸ء ص ۵۰۔۷۵۱،۷

11۔www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=540&cid=313, July 26, 2009

12۔www.al-mawrid.org/pages/articles_urdu_detail.php?rid=1715&cid=295, March 26, 2011

13۔www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=1355&cid=313
September 6, 2010 نیز دیکھیے ماہنامہ اشراق، اپریل ۲۰۰۳، صفحہ ۴۱۔۴۲

14۔ جاوید احمد غامدی، میزان، ص ۹۷، طبع سوم، مئی ۲۰۰۸ء

15۔ جاوید احمد غامدی، میزان، ص ۶۰۱ طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء

16۔ جاوید احمد غامدی، برہان، ص ۳۴ و ما بعد

17۔ البقرہ ۲: ۱۲۰

18۔ جاوید احمد غامدی، برہان طبع ہفتم، صفحہ ۵۵، المورد، لاہور

19۔ جاوید احمد غامدی، برہان طبع چہارم، صفحہ ۱۴۳، المورد، لاہور

20۔ جاوید احمد غامدی، ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی ۲۰۰۲ء، ص ۴۷

21۔ جاوید احمد غامدی، میزان، حصہ اوّل، ص ۲۱۳، طبع ۱۹۸۵ء

22۔www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=586&cid=522
November 6, 2009

23۔www.al-mawrid.org/pages/questions_urdu_detail.php?qid=1036&cid=150
October 30, 2009

24۔ غافر ۴۰: ۱۹

25۔ العادیات ۱۰۰: ۱۰

26۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی ۲۰۰۵ء ص ۴۶:۳۵
27۔ البقرہ ۲: ۲۲۱
28۔ المائدہ ۵:۵
29۔ www.urdu.understanding_Islam.org
30۔ www.urdu.understanding_Islam.org
31۔ www.urdu.understanding_Islam.org
32۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۵۴، ۵۵
33۔ جاوید احمد غامدی، میزان، ص ۱۰
34۔ www.urdu.understanding_Islam.org، نیز دیکھیے محمد عمار خان ناصر، براہین ص ۲۰۷، دارالکتاب، لاہور، ۲۰۱۱ء
35۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء ص ۱۶
36۔ محمد رفیع مفتی، تصویر کا مسئلہ، ص ۳۰
37۔ عمار خان ناصر، براہین ص ۲۳۳ و مابعد دارالکتاب، لاہور، ۲۰۱۱ء
38۔ جاوید احمد غامدی، میزان طبع پنجم، ص ۴۶۔۴۷
41۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۱
40۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ ۲۰۰۴ء ص ۱۶
41۔ جاوید احمد غامدی، میزان ص ۱۰
42۔ جاوید احمد غامدی، میزان ص ۶۵
43۔ ماہنامہ اشراق، شمارہ جون ۲۰۰۲ء ص ۲۹
44۔ عمار خان ناصر، براہین ص ۱۱۵ و مابعد دارالکتاب، لاہور، ۲۰۱۱ء
45۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبہ
46۔ صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ، باب نقض الاحکام الباطلہ
47۔ سنن نسائی، کتاب صلوۃ العیدین، باب کیف الخطبہ
48۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل، باب اذا ارادالله تعالی رحمته امة قبض نبیها قبلها، حدیث نمبر ۲۹
49۔ مولانا محمد تقی امینی، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، اسلامک بک کارپوریشن اسلام آباد، ۱۹۹۲ء